بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

قارئین نے نوٹ کیا ہوگا کہ گزشتہ چند ماہ سے "حکمتِ قرآن" میں قدرے غیر محسوس طور پر انگریزی سیکشن کا آغاز ہو گیا ہے۔ ابتداء میں اگرچہ اس کا باقاعدہ آغاز پیش نظر نہیں تھا' بلکہ صرف محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک کتاب "امتِ مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل" کے انگریزی ترجمے کو' جس کی تیاری پر حال ہی میں محترم ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کی خصوصی محنت صرف ہوئی تھی' "حکمت قرآن" کے قارئین تک پہنچانا مقصود تھا۔ وہ مضمون تین اقساط میں شائع ہوا' لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ اب چل نکلا ہے۔ چنانچہ پہلے اسلام' ایمان اور تقویٰ کے موضوع پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن مرحوم کا ایک وقیع مقالہ اور پھر اسلامک بینکنگ کے موضوع پر محمد اکرم خان صاحب کا ایک فکر انگیز مقالہ' بزبان انگریزی شائع ہوئے۔ بہت سے قارئین نے اس سلسلے کو پسند کیا اور اسے مستقلاً پرچے کا جزو بنانے کا مشورہ دیا ہے۔ ہم اس سلسلے کو مستقل چلا سکیں گے یا نہیں' اس کے بارے میں کچھ کہنا تو شاید قبل از وقت ہوگا' تاہم زیر نظر شمارے میں بھی ایک اہم مضمون' بزبان انگریزی شامل ہے۔ "نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت" کے موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تحریر جو دعوتی و فکری نقطۂ نگاہ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے' کتابی صورت میں بزبان اردو تو بہت عرصے سے دستیاب تھی لیکن شدید خواہش کے باوجود اس کے انگریزی ترجمے کی تیاری اور اشاعت میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔ اب بحمد اللہ اسے انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالنے کا عمل مکمل ہو چکا ہے' چنانچہ اس کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز اسی شمارے سے کیا جا رہا ہے۔ تین یا چار اقساط میں اس مضمون کی اشاعت' ان شاء اللہ' پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی متعدد دیگر تصانیف کی مانند اس کتابچے کو بھی انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا ہفت خواں ان کے برادر خورد ڈاکٹر ابصار احمد نے طے کیا ہے۔ فجزاہ اللّٰہ احسن الجزاء

"مسئلہ سود اور غیر سودی مالیات" کے موضوع پر محمد اکرم خان صاحب کا ایک فکر انگیز مقالہ قریباً دو سال قبل "حکمت قرآن" کے اوراق کی زینت بنا تھا۔ بعد میں اسے مرکزی انجمن نے کتابی صورت میں بھی شائع کیا۔ اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم ہو جانے پر دوبارہ اشاعت سے قبل اسے Revise کرنے کے خیال سے جب مؤلف سے رابطہ کیا گیا کہ کتاب میں اگر کوئی پروف ریڈنگ کی غلطی رہ گئی ہو یا وہ اعداد و شمار کو Update کرنا چاہتے ہوں تو اس کی نشاندہی فرما دیں تو انہوں نے اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اسے بھرپور طور پر Revise کیا اور ہر اعتبار سے Update کر دیا بلکہ کچھ اہم مضامین بھی اضافی طور پر اس مقالے میں شامل کر دیئے جن سے اس کی افادیت میں بلاشبہ خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت تو اغلباً دو ماہ بعد ہی ممکن ہو سکے گی' تاہم قارئین حکمت قرآن کے افادے کے لئے اس تازہ مقالے کو بھی قسط وار پرچے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ OO

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۳ | محرم الحرام ۱۴۱۵ھ، جون ۱۹۹۴ء | شمارہ ۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاھور ۱۴۔ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شادی ہال بکری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۶۰ روپے، فی شمارہ -/۶ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

مطالعۂ قرآن حکیم
ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۂ ھُود

آیات ۹۶-۹۹

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم … امّا بعد

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ○ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ج وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ○ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ

یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ط وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ○ وَاُتْبِعُوْا

فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ط بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ○

"اور ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزات اور واضح سند کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ مملکت کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو انہوں نے فرعون ہی کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا معاملہ درست نہ تھا۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور انہیں لے جا اتارے گا آگ پر اور وہ بدترین گھاٹ ہے جس پر اترا جائے۔ اور پیچھے لگا دی گئی ان کے لعنت اس (دنیا) میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔ کتنا برا صلہ ہے جو کسی کو نصیب ہو!"

قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ، قومِ صالحؑ، قومِ لوطؑ اور قومِ شعیبؑ کے بعد سورۂ ہود کی ان آیاتِ مبارکہ میں قصہ فرعون و موسیٰؑ مختصراً مذکور ہوا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے اس اعتبار سے سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں ایک عکسی نسبت ہے۔ سورۂ یونس کی ۱۰۹ آیات میں سے صرف ۲۳ انباء الرسل پر مشتمل ہیں جبکہ سورۂ ہود کی کل ۱۲۳ آیات میں سے ۷۵ میں ان واقعات کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح وہاں حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے حالات بہت مختصر طور پر بیان ہوئے ہیں اور حضرت موسیٰ اور آلِ فرعون کا ذکر مقابلۃً نہایت تفصیل سے آیا ہے۔ جبکہ سورۂ ہود میں حضرت نوحؑ کا ذکر دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے اور قصہ فرعون و موسیٰؑ صرف چار آیات پر مشتمل ہے۔ یہ قرآن حکیم کی سورتوں میں نسبتِ زوجیت کی نہایت نمایاں مثال ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام" اولوالعزم من الرسل" یعنی چوٹی کے پانچ یا سات برگزیدہ ترین رسولوں میں سے ہیں اور جملہ انبیاء و رسل میں بہت سے اعتبارات سے رسول کامل و اکمل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ان کا ذکر آپ کے بعد سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اور باعادہ تکرار آیا ہے۔ چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی تالیف قصص القرآن میں قرآن حکیم کی ان آیات کی کل تعداد ۵۱۴ بتائی ہے جن میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل اور آل فرعون کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں۔ گویا کہ قرآن مجید کا لگ بھگ تیرھواں حصہ ان کے ذکر پر مشتمل ہے۔

تازہ ترین اثری تحقیقات کے مطابق آنجناب تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصری حکمرانوں کے انیسویں خاندان کی حکومت کے دوران رعمیس دوم نامی فرعون کے زمانے میں پیدا ہوئے اور مشیت الٰہی کے تحت انہوں نے اسی فرعون کے محل اور اسی کی آغوش میں تربیت پائی حالانکہ وہ بنی اسرائیل کے حق میں نہایت ظالم و جابر تھا اور اس نے ان کو تاریخ انسانی کے بدترین مظالم کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اس شخص نے بہت طویل عمر پائی لیکن اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے ڈیڑھ سو بیٹوں میں سے تیرھویں بیٹے منفتاح کو حکومت سنبھلوا دی تھی۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ مدین سے واپسی پر رسالت سے سرفراز ہوئے تو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے جس فرعون کے سامنے پیش ہوئے وہ یہی منفتاح تھا۔

واضح رہنا چاہیے کہ جس طرح ہمارے رسول اکرمؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں یعنی ایک بعثت خاص الی اہل العرب یا الی بنی اسماعیل اور دوسری بعثت عام الی کافۃ الناس، اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی بعثت بھی دو ہری تھی۔ چنانچہ آں جنابؑ کی نبوت تو عام تھی بنی اسرائیل کے لیے بھی اور آل فرعون کے لیے بھی لیکن رسالت کا رُخ صرف آل فرعون کی جانب تھا۔ چنانچہ اس کی صراحت موجود ہے۔ قرآن حکیم کے دوسرے متعدد مقامات کی طرح اس مقام پر بھی کہ" وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِہٖ" یعنی ہم نے موسیٰؑ کو بھیجا فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف۔ ان الفاظ سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مصر میں اُس وقت وہ نظامِ ملوکیت پوری طرح رائج و نافذ تھا جس کے شکنجے میں کم و بیش تین ہزار برس تک تقریباً پوری نوعِ انسانی جکڑی رہی ہے یعنی یہ کہ حاکمِ اعلیٰ ایک بادشاہ ہوتا تھا اور اس کی حکومت قائم ہوتی تھی جاگیرداروں اور منصبداروں یعنی Feudal Lords کے بل پر۔ اس کی حکومت میں عوام الناس

کی حیثیت فی الواقع کالأنعام یعنی حیوانوں کے مانند ہی ہوتی تھی اور جملہ مسائل و معاملات کی باگ ڈور بادشاہِ وقت اور اس کے درباریوں ہی کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ وقت کو بھی براہِ راست ان ہی کے سامنے دعوتِ حق پیش کرنے کا حکم ملا۔

اس مقصد کے لیے جو چیزیں حضرت موسیٰؑ کو حضرتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئیں ان کو یہاں دو اصطلاحات کے ذریعے بیان کیا گیا۔ ایک "اٰیٰتِنَا" اور دوسرے "سلطٰنٍ مبین"۔ ان کے مفہوم کے تعیّن میں مفسرین کے مابین اختلاف ہوا ہے۔ بعض نے آیات یعنی نشانیوں سے مراد عصا اور یدِ بیضا سمیت وہ نو نشانیاں لی ہیں جن کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ میں وارد ہوا ہے۔ اور سلطانِ مبین سے مراد ان میں سے سب سے اہم معجزہ یعنی عصاءِ موسیٰؑ کو مانا ہے۔ اس طرح گویا یہ عطف الخاص علی العام کا معاملہ ہوا۔ بعض حضرات کے نزدیک آیات سے مراد جملہ معجزات ہیں اور "سلطانِ مبین" سے مراد حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر ہے جس نے فرعون کو بالکل لاجواب کر کے رکھ دیا تھا اور اس طرح گویا ان کو کھلا غلبہ عطا کر دیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ فرعون کے اعیانِ سلطنت نے فرعون ہی کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا معاملہ یا اس کی رائے یا اس کی راہ راست نہ تھی: "فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ"۔ امر کا لفظ بہت وسیع المعنیٰ ہے۔ اس میں رائے، مسلک اور معاملات سب کی جانب اشارہ ہے۔ اور الفاظِ قرآنی میں ایک تصویرِ حال سامنے آتی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دربار میں دعوتِ حق پیش فرمائی اور فرعون نے جتنی جرح بھی ان پر کی۔ اس سب میں اسے لاجواب کر کے رکھ دیا اور وہ بالکل کھسیانا سا ہو کر رہ گیا تو ہر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھ لیا تھا کہ حق کس جانب ہے اور موقف کس کا قوی ہے۔ لیکن چونکہ اصل اہم معاملہ مفادات کا ہوتا ہے اور جاگیرداروں اور منصبداروں کے مفادات اس نظام سے وابستہ تھے جس کے مرکز و محور کی حیثیت فرعون کو حاصل تھی جس کی جانب واضح اشارہ سورۃ الزخرف میں منقول فرعون کے ان الفاظ میں موجود ہے کہ: "اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ"۔ یعنی کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ نہروں کے ذریعے آبپاشی کا نظام بھی میرے زیرِ انتظام نہیں ہے؟ لہٰذا انہوں نے من حیث الجماعت اپنا پورا وزن اسی کے پلڑے میں ڈالنے میں عافیت سمجھی۔ بالکل ایسے جیسے علامہ اقبال مرحوم نے اپنی نظم "ابلیس کی مجلس

شوریٰ" میں ابلیس یا اس کے کسی نائب کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ع " نظام کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!"۔

اس کے بعد آیات نمبر ۹۸ اور نمبر ۹۹ کے الفاظ قرآن حکیم میں Pathos یعنی حزن و تاسف کے اظہار کے اعتبار سے ذروۂ سنام یا نقطۂ عروج کی حیثیت رکھتے ہیں: "یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ" یعنی وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا قیامت کے دن اور بالآخر انہیں لے جا اتارے گا جہنم کے گھاٹ پر اور کیا ہی بُرا ہے وہ گھاٹ جس پر اترا جائے۔ یعنی قومِ فرعون نے جس طرح دنیا میں اپنی عقل سے کام لینے اور اپنے شعور کو بروئے کار لانے کی بجائے اندھے بہرے ہو کر فرعون کی پیشوائی کو اختیار کیا اس طرح قیامت کے دن وہ جلوس کی صورت میں فرعون کی قیادت میں جہنم کا رُخ کرے گی اور وہ اسے بالآخر جہنم میں لے جا گرائے گا۔ اور کس قدر بُرا ہے وہ انجام جس تک یہ لوگ پہنچیں گے۔

حواری اور ان کے اتباع میں ان کی قوم کے عوام کالانعام جس کیفیت کے ساتھ فرعون کے پیچھے لگے وہ بالکل ایسے تھا جیسے لعنتِ خداوندی ان کو پیچھے سے دھکیل رہی ہو اور وہ اندھے بہرے ہو کر آگے بڑھے جا رہے ہوں۔ اور یہی نقشہ ان کا قیامت کے روز بھی ہوگا، بلکہ اس روز تو حقائقِ معنوی مجسم ہو کر سامنے آجائیں گے اور لعنتِ خداوندی ان پر پوری طرح مسلّط نظر آئے گی۔

آخری الفاظ یعنی "بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ" میں حزنیہ کیفیت عروج کو پہنچی نظر آتی ہے۔ "رِفد" کے معنی صلے یا عطیے کے ہیں۔ اور یہ نظام ملوکیت کا ایک جانا پہچانا معاملہ ہے کہ بادشاہ اپنے منظورِ نظر اور وفادار نائبینِ سلطنت کو گاہے بگاہے انعام واکرام اور اعلیٰ پوشاکوں اور خلعتوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ تو گویا یہ ہے لعنتِ خداوندی کا وہ اصل انعام واکرام اور ابدی ذلّت و رسوائی کی خلعتِ فاخرہ جو فرعون کی جانب سے اپنے وفاداروں اور حواریوں کو ملی اور کیا ہی بُرا ہے یہ صلہ اور کتنا بھیانک ہے یہ انجام!

یہ واضح رہے کہ یہ معاملہ "حکم الاکثر حکم الکل" کے مطابق ہے ورنہ قرآن حکیم سے ثابت ہے کہ فرعون کے درباریوں میں سے کم از کم ایک صاحب تو ایسے حق پرست نکلے جنہوں نے ایمان کی دعوت پر لبیک کہا اور کچھ عرصہ تک تو اپنے ایمان کو چھپائے رکھا لیکن جب نوبت بایں جا رسید

کہ فرعون حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے پر تُل گیا تو انہوں نے تمام مصلحتوں وغیرہ کا پردہ چاک کر کے نعرۂ حق کو بلند کر دیا اور ایسی فصیح و بلیغ اور مؤثر تقریر دربار میں کی کہ خود فرعون کے چھکے چھوٹ گئے اور اس کا سارا دبدبہ اور طنطنہ ہوا ہو گیا اور وہ کھسیانا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "مَآ اُرِیْکُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی وَمَآ اَھْدِیْکُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ" یعنی "میں تو تم لوگوں کو وہی کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں جو خود مجھے سمجھائی دے رہا ہے' اور میں نہیں رہنمائی کر رہا تمہاری مگر بھلائی کی راہ کی جانب"۔ جس کے جواب میں اس مردِ حق اور بندۂ مومن نے بھرے دربار میں جوابی نعرہ لگایا کہ "یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَھْدِکُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ" یعنی "اے میری قوم کے لوگو! فرعون کے بہکاوے میں نہ آؤ بلکہ میری پیروی کرو میں تمہاری رہنمائی کروں گا بھلائی کی اصل راہ کی جانب!" — یہ دوسری بات ہے کہ قوم کی عظیم اکثریت کی مت بالکل ماری جا چکی تھی اور وہ اپنے دنیوی مفادات کے باعث بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے تھے۔ نتیجہ وہ بدترین انجام سے دوچار ہو کر رہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطبات جمعہ و تقاریر کے نئے تیار شدہ کیسٹ

۱- کیا پاکستان کے خاتمے کا آغاز ہو گیا ہے؟
اور اگر ابھی اسے بچانے کے لئے کچھ کیا جا سکتا ہے تو کیا؟
خطاب جمعہ' ٦ مئی ۹۴ء

۲- پاکستان کی سالمیت اور مسئلہ سندھ
خطاب جمعہ' ۱۳ مئی ۹۴ء

۳- قرآن کا فلسفہ شہادت
خطاب جمعہ' ۱۹ مئی ۹۴ء

۴- انٹرویو' نوائے وقت پینل بسلسلہ پاکستان کی سالمیت
۳۱ مئی ۹۴ء

خودی اور سوشلزم (۸)

کیا سوشلزم ترکِ مذہب اور دہریت سے الگ ہو سکتا ہے؟

ہمارے یہ بھائی اپنی سادہ لوحی سے یہ بھی سمجھتے ہیں کہ سوشلسٹوں کے بے خدا دہریت پر مبنی فلسفہ سے اُن کا کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ فقط سوشلزم کے عملی اقتصادی نظام کو اپنانا چاہتے ہیں لیکن وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر سوشلزم کا فلسفہ غلط ہے تو جو نظام اس فلسفہ کی روشنی میں (بلکہ کہنا چاہیے تاریکی میں) پیدا کیا گیا ہے ضروری ہے کہ وہ بھی غلط ہو اور یقیناً غلط ہے۔ اس لیے کہ وہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ دنیا میں نہ خدا ہے نہ خودی، اور فردِ انسانی از سرتا پا اور اپنے ظاہر اور باطن کے لحاظ سے فقط مادہ کا ایک پُتلا ہے جس میں اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کی محبت کا کوئی بیج نہ موجود ہے نہ نشوونما پا سکتا ہے، جس کا کام فقط مادی منفعت کو جلب اور جذب کرنا ہے، جو حریص پیدا ہوا ہے اور حریص ہی مرے گا، جو ذرائع پیداوار کی ملکیت ایسے عظیم ذمہ دارانہ منصب کے لیے نہ بنا ہے اور نہ اسے سنبھال سکتا ہے (اگرچہ بعض افراد جو اتفاق سے یا کوشش سے سوشلسٹوں کے لیڈر بن جائیں وہ مادی پُتلے ہونے کے باوجود بھی اس منصب کے اہل ہوتے ہیں۔ دلیل ندارد) حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ انسان کی اصل یہ خاکی پُتلا نہیں بلکہ انسان کی خودی ہے جس کا مقصد خود اپنی تربیت اور تعمیر کی خاطر خدا کی محبت، عبادت اور اطاعت کے ذریعہ سے حسن، نیکی اور صداقت کے اوصاف کا اپنانا اور جذب کرنا ہے اور جو اس خاکی پتلے کو اپنے اس مقصد کے لیے عارضی طور پر بحیثیت ایک خادم کے استعمال کرتی ہے۔ ہمارے سوشلسٹ بھائی سوشلسٹ فلسفہ کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ نظام کی صورت میں اُن کی ساری عملی زندگی کو دبا کر اور سکیڑ کر اُن کے مادی پتلے کی عارضی ضروریات کے تنگ دائرہ کے اندر محدود کر دے اور ان کی اپنی یعنی ان کی خودی کی

ضروریات کو بالکل نظرانداز کر دے تعجب ہے کہ اس کے باوجود بھی وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے سوشلزم کے فلسفہ کو قبول نہیں کیا۔ جب انہوں نے اس فلسفہ کے عملی نتیجہ کو' جو اس کا حاصل یا نچوڑ ہے' قبول کر لیا ہے تو وہ کس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اس فلسفہ کو ترک کر دیا ہے؟ خودی کا اقرار کرنا اور خودی کی تعمیر اور تربیت کی ضروریات کا اہتمام نہ کرنا خودی کے انکار کے برابر ہے۔ اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خدا کا اقرار کرنا اور خدا کی عبادت اور اس کے رسول کی موثر اطاعت کے ذریعہ سے خدا کی صفات کے حسن کو دل میں بسانے سے انکار کرنا بلکہ اپنے آپ کو بے خدا سوشلسٹ نظام کی بندشوں کے متضاد اثرات کے سپرد کرنا خدا کے انکار کے مترادف ہے۔ خدا کا انکار کسی بے خدا فلسفہ کو علی الاعلان قبول کرنے پر ہی موقوف نہیں، بلکہ یہ انسان کے دل میں زبان کو چھوڑ کر اور راستوں سے بھی گھس جاتا ہے۔

کارل مارکس کی عبقریت

کارل مارکس کے پہلے کے سوشلزم کو خیالی (UTOPIAN) سوشلزم کہا جاتا ہے لیکن جب سے کارل مارکس نے سوشلزم کو ایک فلسفہ کی شکل دی ہے یہ فلسفہ اس کی ناگزیر قدرتی بنیاد نظر آنے لگا ہے اور اُس کو سوشلزم سے الگ کرنا ممکن نہیں رہا۔ اگر اسے الگ کیا جائے تو وہ علمی اور عقلی بنیادوں سے محروم ہو کر کمزور اور بے اثر ہو جاتا ہے' لہٰذا اب جہاں کہیں سوشلزم کا ذکر آتا ہے وہاں مراد ہی سوشلزم ہوتا ہے جس کا فلسفہ کارل مارکس نے دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب جب کہ مارکس کے فلسفہ کی بنیاد پر دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتیں وجود میں آ چکی ہیں کوئی سوشلسٹ سوسائٹی ان سلطنتوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ کارل مارکس نے سوشلزم کے ساتھ دہریت کا پیوند نہیں لگایا' بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ اس کی عبقریت نے سوشلزم اور دہریت کے اس قدرتی' علمی اور عقلی پیوند کو سمجھا ہے جسے کوئی اور نہیں سمجھ سکا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ گو مارکس سے پہلے درجنوں سوشلسٹ مصنفین گزرے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی سوشلزم کی تحریک کو ایک انقلابی قوت نہ بنا سکا۔ مذہب روح کی پائیدار زندگی پر زور دیتا ہے۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی (فقط بدن کی زندگی) کا مخالف اس لیے ہے کہ جس قدر کوئی شخص بدن کی ناپائیدار زندگی میں غرق ہو گا اسی قدر خدا پرستی اور روح کی زندگی سے محروم ہو

جائے گا۔ اس کے برعکس یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس قدر کوئی شخص روح کی زندگی اور خدا پرستی کو اہمیت دے گا اسی قدر وہ فقط بدن کی زندگی کو بے حقیقت سمجھے گا۔ لہٰذا رُوح کو اور خدا کو جھٹلانا اور کسی (نام نہاد) عقلی استدلال کے بل بوتے پر غیر موجود قرار دینا سوشلزم کی دعوت کو (ناجائز طور پر ہی سہی) وہ ساری اہمیت دے دیتا ہے جو زندگی کے کسی مقصدِ وحید کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر رُوح اور خدا کو موجود اور مؤثر سمجھا جائے تو محض بدن کی زندگی کی اہمیت اور سوشلزم کی دعوت کی قوت دونوں ختم ہو جاتی ہیں۔ سوشلزم کو اپنی معقولیت ثابت کرنے کے لیے دہریت کی ضرورت ہے۔

مصلحت کے ماتحت کوئی سوشلسٹ اپنے آپ کو ایک مذہبی آدمی ظاہر کرتا رہے لیکن عملی طور پر ترکِ مذہب یا دہریت سوشلزم کے لیے لازم ہے۔ اس کے بغیر اور روح کی ضرورتوں کو پوری طرح سے مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی سوشلسٹ سوشلزم پر پورا زور دے ہی نہیں سکتا۔ روس میں مذہب کی خاموش مخالفت مذہب کے ساتھ کسی عداوت کی بنا پر نہیں بلکہ سوشلزم کی ایک شدید ضرورت کی بنا پر ہے۔ اسلام کے جن احکام کو سوشلزم کے مشابہ سمجھا جاتا ہے وہ دراصل خدا کی عبادت کے احکام ہیں اور اُن کا مقصد خودی کی تربیت ہے۔

مغربی جمہوریّت اسلامی تصور نہیں

ہمارے اسلامی سوشلسٹ بھائیوں کا خیال ہے کہ سوشلزم ایک تہذیب ہے اور جمہوریت کی طرح ایک دانائی یا حکمت کی بات ہے' اور حضور کا ارشاد ہے کہ دانائی کی بات جہاں مل جائے اسے اپنا لو، وہ تمہاری ہی گم شدہ چیز ہے۔ لہٰذا جس طرح ہم نے جمہوریت کو اپنایا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم سوشلزم کو بھی اپنا لیں۔ یہ خیال کئی خطرناک غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے بعض کا مغرب سے آئے ہوئے کسی عقیدہ یا عمل کو اپنا لینا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ عقیدہ یا عمل اسلامی ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب اسلام کی بصیرت مفقود ہوتی جا رہی ہے اور مغرب کی تقلید کا رجحان زوروں پر ہے۔ دراصل اسلام مغرب کی ایجاد کی ہوئی اکاون فیصد والی غیر فطری جمہوریت کا قائل نہیں۔ اسلام میں جمہوریت کا مطلب فقط اتنا ہی ہے کہ مشہور اور معروف دینداری اور تقویٰ کے ثقہ اور معتبر لوگ جس شخص کو خلیفہ تسلیم کر لیں اسے سب

تسلیم کرلیں۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت ملک میں ہر وقت موجود رہے گی اور ایسے لوگ اپنے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے خود بخود لوگوں کے راہ نماؤں کے مقام پر ہوں گے۔ خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ مسندِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد ایسے لوگوں کے مشورہ سے کام کرے۔ لیکن اگر وہ ان کی اکثریت کی رائے سے مطمئن نہ ہو تو ضروری نہیں کہ وہ اس پر عمل کرے۔ اس کا اختیار ہے کہ چاہے تو کسی کی رائے نہ مانے اور اپنی رائے کے مطابق کام کرے اور چاہے تو کسی اقلیت کی رائے کے ساتھ اتفاق کر کے قدم اٹھائے لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ خلیفہ کی جو رائے بھی ہو سب اس کی اطاعت کریں اور اس کا حکم بجالائیں۔ اگر اکاون فیصد کی جمہوریت کوئی اسلامی تصور ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ نے جب دیکھا تھا کہ حضرت عمرؓ کے سمیت تمام صحابہؓ مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے خلاف ہیں تو آپ یہ نہ فرماتے: واللہ لأجاھدنّھم ولو منعونی عقالاً کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ زکوٰۃ کی ادائیگی سے رسی کا ایک ٹکڑا بھی روکیں گے تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ حضرت ابوبکر صدیق کی رائے درست تھی اور اگر وہ اکثریت کی رائے پر عمل کر کے جنگ نہ کرتے تو اسلام ہم تک نہ پہنچ سکتا۔ اس سے پہلے اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح اقبال نے مغربی قسم کی جمہوریت کی مذمت اس بنا پر کی ہے کہ وہ خودی کی فطرت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ جہاں جہاں ہم نے مغربی جمہوریت کو اپنایا ہے اس کی وجہ اسلام سے ہماری بے خبری اور دوری اور مغرب کے تصورات سے رغبت اور الفت ہے۔ ہمارا مغربی جمہوریت کو اپنانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارا مغربی لباس کو یا بیسیوں اور عادات واطوار کو اپنانا۔

دانائی کو ترک کرنا دانائی نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ ہم مسلمان رہتے ہوئے کسی ایسے عقیدہ یا عمل کو تہذیب یا دانائی نہیں کہہ سکتے جو اسلام کے واضح قوانین اور احکام کے ساتھ متصادم ہوتا ہو اور ان کی جگہ لینا چاہتا ہو مثلاً ہم زکوٰۃ اور وراثت ایسے قوانین کو ترک کر کے سوشلزم کے قوانین کو نافذ نہیں کر سکتے۔ جہاں اسلام کے قوانین پہلے موجود ہوں ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ طلب کرنا، سراہنا اور قبول کرنا کفر صریح ہے

اس سے پہلے اس کتاب میں اس موضوع پر قرآن حکیم کے ارشادات نقل کیے جا چکے ہیں۔ پھر ان ارشادات کی عقلی اور عملی بنیادوں کی وضاحت کرتے ہوئے زندگی کی خصوصیات اور ارتقاء کی ضروریات کی روشنی میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ خودی کی آزادانہ اور مکمل نشوونما کے لیے رسولؐ کی ہو بہو اطاعت کیوں ضروری ہے۔ ناظرین ان معروضات کو بھی ذہن میں رکھیں۔ تاہم جہاں اسلام کے قوانین پہلے موجود نہ ہوں، ہم موجود قوانین کی روشنی میں ضروری غیر موجود قوانین وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ اور وراثت ایسے قوانین کو نافذ کرنے کے بعد اگر ضرورت ہو تو ہم معاشی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کسی ازم کی نقل کرتے ہوئے نہیں بلکہ تعلیمات اسلام کی روشنی میں' حالات کے مطابق اور قوانین بنا سکتے ہیں۔

فطرتِ انسانی سے لاعلمی کا نتیجہ

تیسری بات یہ ہے کہ سوشلزم معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کی ایک تجویز کی حیثیت سے فطرتِ انسانی کی انتہائی لاعلمی پر مبنی ہے' اور جس تجویز کی بنیاد ایسی لاعلمی پر ہو وہ نہ تو کوئی دانائی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی تہذیب یا شائستگی پیدا کر سکتی ہے' بلکہ انسان کو شاہراہِ ارتقاء سے ہٹا دینے کی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اس کو زود یا بدیر ایسی طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا کر دے جن سے نجات پھر اسی شاہراہ کی طرف لوٹنے کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ جب یورپ میں مشینوں کا دور شروع ہوا اور بڑے پیمانہ کی صنعت وجود میں آئی تو کارخانہ دار یا سرمایہ دار اس موقف میں ہو گیا کہ مزدور کی محنت کی کمائی کا بہت سا حصّہ خود کھا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود روز بروز زیادہ دولت مند اور مزدور روز بروز زیادہ مفلس ہوتا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کارخانہ دار دولت مند ہونے کے باوجود مزدور پر یہ ظلم کیوں روا رکھتا تھا۔ وہ یہ کیوں نہ سوچ سکا کہ مزدور کی محنت سے جو نفع اسے حاصل ہوتا ہے وہ اس میں سے اتنا ہی لے جتنا اس کا حق بنتا ہے اور باقی مزدور کو دے دے۔ وہ حرص اور لالچ اور بخل اور ظلم کے رذائل کے ماتحت کیوں کام کرتا رہا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ معنیٔ آدم سے یا اپنی فطرت یا اپنی خودی کے حقائق سے ناواقف تھا۔ علم ہی عمل کو پیدا کرتا اور روکتا ہے۔ جو شخص جانتا ہو کہ آگ جلا دیتی ہے وہ آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ مثلاً مغربی کارخانہ دار کو علم نہیں تھا۔

۱۔ کہ وہ خود یا انسان کی حیثیت سے اس کی اصل اس کی خودی ہے' اس کا جسم نہیں۔

۲۔ کہ اس کا جسم فانی اور ناپائدار ہے' لیکن اس کی خودی کی زندگی یا دوسرے لفظوں میں اس کی اپنی زندگی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔

۳۔ کہ اس کی خودی صرف ایک ہی آرزو رکھتی ہے اور وہ خدا کی محبت کی آرزو ہے اور لہٰذا صرف اسی آرزو کی تشفی سے اسے مکمل اور مستقل اطمینانِ قلب اور مکمل خوشی اور آسودگی حاصل ہو سکتی ہے۔

۴۔ کہ خدا وہ ذات پاک ہے جو حسن کی ابتدا اور انتہا ہے اور جس کی تمام صفات بدرجۂ کمال حسین و جمیل ہیں۔

۵۔ کہ اس کی اور تمام آرزوئیں اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کے جسم کی آرزوئیں ہیں اور اس کا جسم اس کی خودی کا ایک آلہ کار ہے جو اسے عارضی طور پر اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اسے کام میں لا کر اپنی واحد آرزو یعنی خدا کی محبت کی تشفی کرے۔

۶۔ کہ اگر وہ خدا کی آرزو کی تشفی نہ کر سکے گا تو اندر سے غیر مطمئن اور ناخوش اور غمگین رہے گا' اور کسی اور جسمانی آرزو کی تشفی کا سامان مثلاً دولت مندی یا عیش پرستی خدا کی آرزو کی تشنگی کی تلافی نہ کر سکے گا۔ تاہم اس کے اندرونی غم اور باطنی ناخوشی اور بے اطمینانی کی حالت اُس وقت پوری شدت پر ہو گی جب جسم کی موت واقع ہو جائے گی اور اس کی لذتیں ختم ہو جائیں گی۔

۷۔ کہ خدا کی آرزو کی تشفی کا طریق یہ ہے کہ خدا کی صفات کے حسن کو دل میں بسایا جائے اور خدا سے جس قدر زیادہ ہو سکے محبت کی جائے' اور اس کے دو بڑے ذرائع ہیں: ایک خدا کی صفات پر غور و فکر جسے ذکر اور عبادت کہتے ہیں اور دوسرا خدا کی صفات کے مطابق عمل جسے نیک عملی کہتے ہیں۔ نیکی، رحم، انصاف اور دوسروں کی پرورش خدا کی صفات کے مطابق عمل ہے اور حرص، لالچ، بخل، مزدور پر ظلم اور اس کی حق تلفی خدا کی صفات کے مطابق عمل نہیں۔

۸۔ کہ خودی کی فطرت اس قسم کی ہے کہ اس کا ہر عمل' نیک یا بد، چھوٹا یا بڑا، جو وہ اس دنیا میں کرتی ہے اس کے اندر لاشعور میں محفوظ ہو جاتا ہے اور جسم کی موت کے بعد اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اور خودی نیک اعمال کا اچھا صلہ خوشی اور راحت کی صورت میں اور بُرے اعمال کی سزا رنج اور غم کی صورت میں پاتی ہے۔

۹۔ کہ جسم کی طرح خودی بھی ایک طرح کی بھوک محسوس کرتی ہے۔ اگر جسم کی بھوک ایسی اچھی غذا کھانے سے دور ہوتی ہے جس میں حیاتین اور پروٹین ایسے تمام ضروری عناصر بدرجہ اتم موجود ہوں تو خودی کی بھوک کسی ایسے عمدہ نصب العین کے حسن کو جذب کرنے سے دور ہوتی ہے جس میں تمام صفاتِ حسن بدرجہ کمال موجود ہوں یہی نصب العین خدا ہے۔ اگر جسم غذا کو چبا کر نگل کر اور ہضم کر کے جذب کرتا ہے تو خودی عبادت اور نیک عملی کے ذریعہ سے حسن کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے اس سے لذّت اندوز ہو کر اور اسے اپنا کر جذب کرتی ہے۔

۱۰۔ کہ خودی حسن کو جذب کرنے سے ہی توانا اور قوی اور زندہ اور شادمان ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کو جذب نہ کرے تو کمزور اور مضمحل اور قریب المرگ اور غمگین ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی کے لیے جو بھوک سے مر رہا ہو یہ جاننا کافی نہیں کہ اس کی الماری میں بہت سی عمدہ مٹھائی پڑی ہے۔ اپنی جان کو بچانے کے لیے اسے تکلیف کر کے اس مٹھائی کو کھانا پڑے گا۔ اسی طرح ایک ایسے آدمی کے لیے جس کی خودی گرسنگی حسن سے مر رہی ہو یہ جاننا کافی نہیں کہ خدا موجود ہے اور وہ حسن ہے۔ اسے چاہیے کہ عبادت اور نیک عملی کے ذریعہ سے اس حسن کو جذب کرے۔

۱۱۔ کہ خودی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر وہ انسان کی نادانی کی وجہ سے سچے خدا کی آرزو کی تشفی نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس کی آرزو کی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ راہِ راست سے بھٹک کر کسی غلط مقصود کو، جو خودی کو کمزور اور مضمحل اور غمگین اور قریب المرگ کرنے والا ہو، اپنا لیتی ہے۔ کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کی حرص اور مزدوروں پر ان کا ظلم اسی وجہ سے ہے کہ ان کی فطری آرزوئے حسن راہِ راست سے بھٹک کر خدا کی بجائے دولت اور عیش پرستی کو اپنا مقصود بنا رہی ہے اور وہ خود اپنی ضرورتوں کو ترک کر کے فقط جسم کی خواہشات کو اپنی توجہ کا مرکز بنا رہے ہیں۔

پہلا اور بنیادی علاج

فطرتِ انسانی کے یہ حقائق ایسے ہیں کہ ان سے انکار ممکن نہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر سرمایہ داروں کے ظلم کا پہلا اور بنیادی علاج یہ تھا کہ جس آرزو کے بھٹکنے سے وہ ممکن ہوا ہے اسے پورے معاشرہ کی تعلیم اور تربیت کے ذریعہ سے پھر صحیح راستہ پر ڈالا جاتا اور اسے اس کے اصلی اور

فطری مقصود یعنی خدا کی طرف لوٹایا جاتا، اور پھر تعلیم و تربیت ہی کے ذریعہ سے خدا کی محبت کی نشوونما کر کے اسے درجۂ کمال پر پہنچایا جاتا، تاکہ اس معاشرہ میں پھر ایسے سرمایہ دار پیدا نہ ہو سکتے۔ بلکہ اور بھی کوئی اخلاقی خرابی پیدا نہ ہو سکتی۔ اور پھر اگر ضرورت ہوتی تو ایسے قوانین بھی بنائے جاتے جو افراد کی کمزوریوں کے خلاف ان کی مدد کرتے اور ان کو زندگی کے اقتصادی شعبہ میں کوئی ایسا کام کرنے نہ دیتے جو ان کی تمنائے حسن کے ساتھ مزاحمت کرتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقی رذائل سے گھری ہوئی ایک پست حال قوم کو اخلاقی رفعت اور شائستگی کے کمال پر پہنچایا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کو اس سب سے پہلے اور بنیادی علاج میں سے گزارا گیا تھا، اگرچہ اس علاج کی مزید تقویت کے لیے زکوٰۃ اور وراثت ایسے قوانین بھی وضع کیے گئے تھے۔ اگر اُس وقت یورپ میں سچا اسلامی معاشرہ ہوتا تو وہاں اس قسم کے سرمایہ داروں کا وجود ممکن نہ ہوتا لیکن یورپ جس طرح آج فطرتِ انسانی کی لاعلمی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے اُس وقت بھی ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں کون ہو سکتا تھا جسے معلوم ہوتا کہ سرمایہ داروں کے ظلم کا اصل سبب کیا ہے اور اس کا اصل علاج کیا ہے، اور جو فطرتِ انسانی کے ٹھوس علم کی بنا پر اس سب سے پہلے اور بنیادی علاج کو جاری کرتا۔ وہاں سرمایہ دار نہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو عقلاً اور حکماً سمجھے جاتے تھے فطرت انسانی کی اسی لاعلمی کا شکار تھے لہٰذا وہ دوسروں کی راہ نمائی کیسے کرتے۔ ع

آں کس کہ خود گم است کرا رہبری کند

الموائے مرض علاج نہیں

کچھ نام نہاد دانشوروں نے جنہیں بعد میں سوشلزم کے مفکرین اور مصنفین کہا گیا یہ سمجھا کہ سرمایہ دار فطرتاً حریص اور ظالم ہے اس کا علاج سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ اس کا کارخانہ چھین کر حکومت کو دے دیا جائے لیکن انہوں نے نہیں سمجھا کہ حکومت کے لوگ جو سب سے اوپر ہو کر پھر کارخانہ کو سرمایہ سے چلائیں گے وہ بھی تو سرمایہ دار ہی ہوں گے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اور سرمایہ داروں کی طرح حریص اور ظالم نہیں ہوں گے۔ اس طرح سے انہوں نے جہاں تک ان کی تجویز کا تعلق ہے مشکل کو حل نہیں کیا بلکہ مشکل کو ایک جگہ سے اٹھا کر اپنے ہی ملک میں دوسری جگہ

رکھ دیا، تاہم ان کی بات کو کسی نے نہیں مانا۔ بعد میں سوشلزم کا ایک فلاسفر کارل مارکس آیا۔ اس نے اس تجویز میں یہ اضافہ کیا کہ دلفریب مستقبل کے سہانے خوابوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ مزدور کو چاہیے کہ جبر و تشدد اور قتل و غارت اور لوٹ مار اور آتش زنی اور دہشت انگیزی سے کام لے کر سرمایہ داروں کے کارخانوں پر اور پوری حکومت پر قبضہ کر لے۔ لیکن مزدور بھی بہرحال ایک انسان ہوتا ہے جس کے اعمال کا بھی ضابطہ یا قاعدہ یا حسن و قبح کا معیار ہوتا ہے، جس کا منبع فطرتِ انسانی کا کوئی واضح سائنسی علم نہ سہی لیکن ایک خوف سے ملا ہوا غیر واضح قسم کا مذہبی عقیدہ ضرور ہوتا ہے۔ اس کے لیے مشکل تھا کہ محض اپنی اجرتوں کو بڑھانے کے لیے اس قسم کے سنگین جرائم کا ارتکاب کرتا، خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس سلسلۂ جرائم کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کارل مارکس نے مزدوروں اور ان کے راہ نماؤں کی ذہنی مشکلات کا علاج یہ کیا کہ سوشلزم کا ایک فلسفہ بنا دیا جس میں استدلال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا میں نہ خدا ہے نہ روح، نہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے اور نہ اعمال کا محاسبہ۔ انسان فقط مادہ کی ایک ترتیب اور ترکیب کا نام ہے جو موت پر ختم ہو جاتی ہے' لہٰذا خوف کس کو، کس خدا کا اور کون سے محاسبہ کا؟ باقی رہا یہ سوال کہ ان جرائم کا نتیجہ کیا ہوگا، سو ارتقاء کی مادی اور میکانکی قوتیں اس طرح کام کر رہی ہیں کہ دنیا میں مزدور کا غلبہ ہو کر رہے گا اور مزدور کا تشدد ہی اس غلبہ کا ذریعہ بنے گا۔ کاش کہ مارکس کو علم ہوتا کہ ارتقاء کی قوتیں مادی اور میکانکی نہیں بلکہ ایک ربّ العالمین کی ربوبیت کا مظہر ہیں اور آخر کار دنیا میں وہی قوم غالب رہے گی جو اس ربّ العلمین کو دل سے مانے گی اور اس کی محبت کو انسانی معاشرہ کی تمام خرابیوں کو دور کرنے کا ایک ہی صحیح اور فطری اور مستقل ذریعہ تسلیم کرے گی اور اس ذریعہ کو کام میں لائے گی۔

مارکس کی تشدد پسندی

حاصل یہ ہے کہ کارل مارکس نے سوشلزم کو ایک فلسفہ کی شکل اس لیے دی ہے کہ وہ تشدد کے لیے ایک کامیاب محرک بن جائے' لہٰذا اس نے سوشلزم کے پہلے مفکرین کے طریقِ کار میں سوائے تشدد کے اور کسی بات کا اضافہ نہیں کیا۔ اس نے بھی اپنے پیشرو سوشل فلاسفروں کی طرح سرمایہ دار کا استیصال نہیں کیا، بلکہ اسے ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ کھڑا کر دیا ہے۔ بڑے

پیمانے کی صنعت سرمایہ کے بغیر چل نہیں سکتی، اور اگر سرمایہ رہے گا تو ضروری ہے کہ اس کا کوئی مالک بھی ہو جو اس کی حفاظت کرے، اس کو تلف ہونے سے بچائے، اس کے مفاد کو سوچے اور اس کو صحیح طور پر کام میں لگائے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اس کا مالک مزدور ہے محض اس لیے کہ کسی کاغذ پر ایسا لکھا ہوا ہے۔ مزدور کو تو اپنی اجرت سے واسطہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ اجرت زیادہ سے زیادہ ہو لیکن اگر اجرت زیادہ ہو گی تو سرمایہ کم ہو جائے گا اور اگر سرمایہ کو زیادہ رکھنے کی ضرورت ہو گی تو اجرت کم کرنا پڑے گی۔ اس طرح سرمایہ اور محنت کے مفاد کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں اب بھی کچھ لوگ کام کرنے والے ہیں اور کچھ کام کروانے والے۔ کام کرنے والوں پر نگران مقرر ہیں اور پھر ان نگرانوں پر اور نگران اور پھر ان پر بھی اور نگران، وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اور یہ سلسلہ کمیونسٹ پارٹی پر ختم ہوتا ہے جو روس کے اصلی سرمایہ دار ہیں۔ مارکس کے علاج میں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ مزدور اور اس کا نگران ہر حالت میں حرص اور بددیانتی سے محفوظ رہیں گے۔ اگر اندر سے نیت درست نہ ہو تو نگران سے آنکھ بچائی جا سکتی ہے اور قانون کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔

اگر قانون انسان کی فطری آرزوؤں سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو انسان کچھ عرصہ کے لیے اس سے ڈر سکتا ہے لیکن اس کا احترام نہیں کر سکتا۔ اور ایسا ڈر ایک قسم کی غلامی ہے جو غیر فطری ہے اور انسان کی خودی جس کی خاصیت آزادی ہے تادیر غلامی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا روسی نظام کی خرابی اس کی تعمیر میں مضمر ہے اور اسی لیے وہ ناپائدار ہے اور دنیا کا وہ آخری انقلاب ("فتنہ") نہیں بن سکتا جس سے شیطان ڈر رہا ہے۔ معاشرہ کی تمام خرابیوں کا پہلا بنیادی اور فطری علاج یہ ہے کہ انسان کی اس آرزو کو، جو بھٹک کر یہ خرابیاں پیدا کرتی ہے یعنی خدا کی آرزو کو، تعلیم و تربیت سے اس کے اصل مقصود کی طرف لوٹایا جائے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ دانائی کی ابتدا خدا کے خوف سے ہوتی ہے: رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللهِ۔

مہلک راہ نمائی

نوعِ انسانی کی سب سے بڑی بدخدمتی جو کارل مارکس سے سرزد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی وہی آرزو جو اصلِ انسان ہے، جس کا مقصود انسان کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے، جو انسان کے لیے

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

مسئلۂ سود
اور
غیر سودی مالیات

محمّد اکرم خان

سود اور مالیاتی نظام کے بارے میں ایک نہایت قیمتی مقالہ جس کے طبع ثانی کے موقع پر مولف نے اسے نہ صرف یہ کہ بھرپور طور پر نظرِ ثانی کے عمل سے گزارا ہے بلکہ بعض اہم اور مفید مباحث مزید بھی اس میں شامل کئے ہیں۔ (ادارہ)

اس مقالہ کا مقصد قرض کے معاملات میں سود کے چلن کا تجزیہ اور ایک غیر سودی مالیاتی نظام کے بنیادی خدوخال کی تشریح کرنا ہے۔

پاکستان کی تشکیل کے ساتھ ہی یہاں پر ایک خالص اسلامی معاشرہ کے قیام کی جدّوجہد شروع ہوگئی۔ مختلف دینی اور سیاسی جماعتوں نے اس کے لئے خلفائے راشدین کے دور کی طرز پر ایک اسلامی ریاست کے قیام پر زور دینا شروع کیا۔ یہ بات کہ موجودہ نظام حکومت اور معاشرہ ایک سرمایہ دارانہ تمدن پر مبنی ہے ہر ذہین آدمی کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتی تھی کہ موجودہ دور میں اسلام کے بنیادی اصول کس طرح نافذ کئے جائیں گے۔ ان میں سب سے پیچیدہ مسئلہ سود کا ہے۔ اسلامی نظام حیات کے نعرہ کے ساتھ ہی جہاں علمائے دین کی طرف سے سود کی حرمت اور بلاسودی مالیاتی نظام کا نقشہ پیش کئے جانے کی متعدد کوششیں ہوئیں وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک ایسا ردِّ عمل پیدا ہوا جس کو ہم "ذہنی شکست" یا "علمی مرعوبیت" کا نام دے سکتے ہیں۔ اس طبقہ نے محسوس کیا کہ سود کا معاملہ اتنا پیچیدہ اور دقیق ہے کہ موجودہ مالیاتی نظام کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکے بغیر اسے ختم نہیں کیا جا سکتا، اور چونکہ ایسا عمل بہت بڑے عملی بحران پر منتج ہوگا لہٰذا ان کا ذہن اس طرف مائل ہوا کہ قرآن اور حدیث میں "رِبا" کی حرمت کو از سرِ نو دیکھا جائے۔ چنانچہ ان کی طرف سے

یہ مقدمہ قائم کیا جانے لگا کہ دراصل "ربا" اور "سود" دو مختلف چیزیں ہیں۔ جو چیز حرام ہے وہ ربا ہے اور جو رائج الوقت مالیاتی اداروں میں مروج ہے وہ سود ہے۔ اول الذکر بلاشبہ حرام ہے لیکن مؤخرالذکر جائز اور مباح ہے۔

اس مقدمہ پر 1960ء کے عشرہ میں بہت سا لٹریچر وجود میں آیا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ چند ایک علماء نے بھی یہی موقف اختیار کیا۔ اس کے جواب میں پچھلے تیس سالوں میں ہزاروں صفحات پر مبنی سینکڑوں مضامین' مقالات اور کتب لکھی گئی ہیں' جن میں دو ٹوک اور مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دراصل "ربا" اور "سود" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس عرصہ میں بیسیوں کانفرنسوں اور سیمینارز میں اَن گنت مسلم معاشیات دانوں' علماء اور مفکرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان اجتماعات میں سے اکثر کی کارروائیاں چھپ چکی ہیں اور حاصل کی جا سکتی ہیں[1]

نومبر 1991ء میں پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت نے بھی مسئلہ سود پر اپنے تاریخی فیصلہ میں اس موضوع پر بہت سا قیمتی مواد جمع کیا ہے۔ اس فیصلہ میں بہت وضاحت سے دکھایا گیا ہے کہ عربی لغت' قرآن کا متن' اہم تفاسیر' احادیث' احادیث کی تشریح' فقہ اور تاریخ سب اس بات کا حتمی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ سود اور ربا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں[2] اس کے علاوہ مسلمان امت کے بڑے بڑے اجتماعی ادارے' مثلاً او آئی سی (O.I.C) کی فقہ اکیڈمی' ہندوستان کی فقہ اکیڈمی' اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان' جامعہ ازہر وغیرہ میں سینکڑوں علماء نے بار بار بالاتفاق یہ رائے دی ہے کہ ربا اور سود ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے[3]

اتنی زیادہ شہادتیں جمع ہو جانے کے بعد یہ بات بلاخوف و خطر کہی جا سکتی ہے کہ اس بات پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہے کہ سود اور ربا ایک ہی چیز ہے اور سود حرام ہے۔ اس بحث کے بعد اور اتنے شواہد کی موجودگی میں اب یہ بات تحصیلِ حاصل کے مترادف ہے کہ از سرِ نو اس بحث کو چھیڑا جائے اور ثابت کیا جائے کہ ربا اور سود ایک ہی چیز ہے' لیکن حال ہی میں پاکستانی اخباروں میں بہت سے مضامین اور خطوط ایسے چھپے ہیں جنہوں نے اس بحث کو از سرِ نو چھیڑا ہے[4] اگرچہ اس بحث کا مختصر جواب تو یہی ہے کہ یہ بحث لٹریچر سے بے خبری کی بنیاد

پر دوبارہ شروع کی گئی ہے اور جس کی تسلی نہ ہو وہ مشاہیر کی تحریروں کو دیکھ لے اور پھر جن سوالات کا جواب نہ ملے وہ بیان کرے' لیکن یہ دیکھ کر کہ سب لوگوں کی رسائی اس لٹریچر تک نہیں ہے ہم انتہائی اختصار سے یہاں پر اس موضوع پر چند بہت ہی اہم دلائل کا ذکر کرتے ہیں اور سود اور ربا کے فرق پر عام طور پر دیئے گئے دلائل کی کمزوری واضح کرتے ہیں۔

I- رِبا اور سُود کا فرق

ا- پیدا آور اور صرفی قرضوں کا فرق

ربا اور سود میں فرق کرنے والے عام طور پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ ربا دورِ جاہلیت مین رائج صَرفی قرضوں پر ایک ظالمانہ زیادتی کا نام تھا' جس سے غریب کی خون پسینے کی کمائی مہاجن لے جاتا تھا۔ شریعت اسلامی نے اس ظلم کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس دور میں تجارتی قرضوں کا رواج نہ تھا' چنانچہ تجارتی قرضوں پر سود ظلم نہیں ہے' کیونکہ اس میں کاروباری حضرات جو سرمایہ قرض پر لیتے ہیں اس سے مزید دولت کماتے ہیں اور اس میں سے ایک حصہ سود کی شکل میں صاحبِ مال کو دیتے ہیں۔ اس مقدمہ میں چند در چند غلطیاں ہیں:

اوّل' یہ بات اصولِ شریعت کے خلاف ہے کہ صرف انہی معاملات پر شریعت کے قواعد کا اطلاق کیا جائے جو حضور ﷺ کے زمانے میں رائج تھے' جیسے کہ اگر کوئی کہے کہ "خَمر" کی حرمت میں صرف وہ شرابیں حرام ہوں گی جو اس زمانے کے عرب پیا کرتے تھے تو یہ دلیل بیّن طور پر غلط ہے' اس لئے کہ اس سے حرمتِ خمر ختم ہو سکتی ہے۔

دوم' تاریخی طور پر یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں عربوں میں تجارتی قرضوں کا رواج عام تھا۔[۵] بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ تر قرضے

تجارتی مقاصد کے لئے تھے تو مبالغہ نہ ہوگا' کیونکہ وہ ایک قبائلی معاشرہ تھا جس میں تنگ دست کی کفالت اور دیکھ بھال قبیلہ خود کرتا تھا (جیسے کہ شعبِ ابی طالب کے زمانہ میں خود حضور ﷺ کے ساتھ ہوا) اور قبیلہ کے لئے یہ بات باعثِ ننگ وعار تھی کہ اس کا کوئی فرد اپنی بنیادی ضرورت کے لئے سود پر قرض لے' لیکن اگر کہا جائے کہ صرفی قرضے بھی متداول تھے تو تجارتی قرضوں کے رواج کا تاریخی طور پر ثبوت موجود ہے۔

سوم' یہ بات بھی ہرحال میں صحیح نہیں ہے کہ کاروباری حضرات جو سود ادا کرتے ہیں وہ اپنے نفع کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ کاروباری مقروض کو نفع نہ ہو بلکہ نقصان ہو' سود تو اسے پھر بھی دینا ہی پڑے گا۔ اس صورت میں ظلم کی شکل واضح طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

چہارم' یہ بھی ایک دھوکہ ہے کہ تجارتی اموال میں سود ظلم نہیں ہے' حقیقت یہ ہے کہ مرکب سود میں ظلم اس طرح پنہاں ہے کہ عام آدمی کو نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر پاکستان میں ڈیفنس سیونگ سکیم پر اگر آج 100 روپے جمع کرائے جائیں تو دس سال بعد 442 روپے ملتے ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ شرح سود 34.2 فی صدی ہے لیکن اگر کوئی یہ انتظام کرے کہ یہ رقم 100 سال تک اسی طرح سود پر لگی رہے تو یہ جمع ہو کر 279,116,294 روپے ہو جائے گی۔ گویا حقیقی شرح سود 27 لاکھ فی صدی سالانہ ہوئی۔

ایک اور مثال لیجئے۔ جرمنی میں اوٹو ایف شون بیک (Otto F. Shoenbeck) نے 1972ء میں 100 مارک 250 سال کے لئے سات فی صدی شرح سود پر جمع کرا دیئے اور بینک سے معاہدہ کر لیا کہ 2222ء میں اس کے لواحقین کو اصل بمع سود واپس کر دیا جائے۔ اس سال یہ رقم 221,179,400 مارک ہو چکی ہوگی' اور اس کی حقیقی شرح سود 887,169 فی صد ہوگی۔ کیا ہم اسے

غیر ظالمانہ کہہ سکتے ہیں؟

ایک اندازہ کے مطابق امریکہ میں اس وقت کارپوریشنز کے ادھار کا یہ عالم ہے کہ اگر شرح سود میں ایک فیصد اضافہ ہو جائے تو ادھار کا بوجھ دو سے تین بلین ڈالر بڑھ جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ کہنا کہ تجارتی قرضوں پر سود کوئی ایسا بوجھ نہیں جسے ظلم کہا جا سکے اس کے اصل روپ سے بے خبری کی وجہ سے ہے۔

پنجم' یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے کہ آج کل کے دور میں زیادہ قرضے تجارتی ہیں اور صَرفی قرضے کم ہیں۔ اگر ہم کسی بھی ملک کی معیشت کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلے کہ آج کل سب سے زیادہ قرضے تو حکومتوں نے لے رکھے ہیں جن کا زیادہ استعمال صرفی نوعیت کا ہے۔ خود پاکستان ہی کو دیکھیں' جون 92ء تک حکومت پاکستان نے صرفی ضرورتوں کے لئے حسب ذیل قرضے لے رکھے تھے:

نیشنل سیونگ سکیموں سے	164 :	ارب روپے
تجارتی بینکوں سے	25 :	ارب روپے
سٹیٹ بینک سے	113 :	ارب روپے
کُل	302 :	ارب روپے

(ماخذ: سٹیٹ بینک رپورٹ 1992-93ء ص 36' 89' 189)

جب کہ اسی تاریخ کو پوری پاکستانی قوم کی بچتیں حسب ذیل تھیں۔

نیشنل سیونگ سکیموں کے حوالے سے	164 :	ارب روپے
بینکوں میں میعادی بچتیں	258 :	ارب روپے
کل	422 :	ارب روپے

(ماخذ: سٹیٹ بینک رپورٹ 1992-93ء ص 34' 89)

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ 30 جون 92ء کو پوری قوم کی بچتوں کا 71

فی صدی حصہ حکومت نے اپنی صرفی ضرورتوں کے لئے قرض لے رکھا تھا۔ حکومت یہ قرض غیر ترقیاتی کاموں پر خرچ کرتی ہے جیسے دفاع' تنخواہیں وغیرہ۔ مزید برآں بہت بڑے پیمانے پر اِس وقت دنیا میں صرفی قرضے کریڈٹ کارڈ' ہاؤسنگ فنانس اور دیگر اثاثہ جات کی خریداری کیلئے لئے جاتے ہیں۔ امریکہ میں ایسے قرضوں کے بارے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ کل قرضوں کا 13 فی صد ہیں۔ ایسے حالات میں یہ دعویٰ کہ آج کل کے دور میں زیادہ تر قرضے پیداآوری ہیں حقیقت کے خلاف ہے۔

ب۔ سُود اور افراطِ زر سے روپے کی قدر میں کمی کا مسئلہ

سود کے حق میں ایک دلیل یہ دی جانے لگی ہے کہ آج کل کے دور میں افراطِ زر کے مسلسل رجحان سے روپے کی اصل قدر و قیمت میں کمی ہو رہی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے قرض پر کوئی رقم بطورِ سود زائد وصول کرتا ہے تو وہ اصل میں زر کی قدر میں اس کمی کی تلافی ہی ہے۔ اس وجہ سے سود کو برا نہیں کہا جا سکتا' بلکہ یہ تو انصاف قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ دلیل بھی کئی اعتبارات سے کمزور ہے:

اوّل' افراط زر صرف قرض خواہ ہی کو متأثر نہیں کرتا' بلکہ وہ معاشرہ کے دیگر افراد جیسے کہ تنخواہ دار طبقہ' مزدور طبقہ' چھوٹے دکان دار' پنشنرز' کرایہ کی آمدنی پر انحصار کرنے والے وغیرہم کو بھی متأثر کرتا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کی بھی تلافی کی بات نہیں کی جاتی بلکہ صرف صاحبِ سرمایہ طبقہ کے تحفظ کا سوال پیدا کیا جاتا ہے۔ اگر معاشرتی انصاف ہی مقصود ہے تو ہر طبقہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ غور کریں کہ اگر سب کی تلافی کا سوچیں گے تو معاشرہ میں کس قدر اہم تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ اور اگر اس طرح عمومی اضافہ (General Indexation) کی جائے تو اس سے افراط زر کا ایک لامتناہی چکر شروع ہو جائے گا۔ اس موقع پر یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جن ملکوں نے افراطِ زر کا علاج عمومی اضافے (General Indexation) میں سمجھا انہیں اس مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس سے

افراط زر میں اضافہ ہی ہوا ہے۔[۸]

دوم' افراطِ زر کے ذریعہ سے قدر و قیمت میں کمی مقروض کے کسی عمل سے وجود میں نہیں آتی' پھر مقروض کو اس کی تلافی پر کیوں مجبور کیا جائے؟

سوم' خود افراط زر کی بڑی وجہ یہ سود ہی ہے' اس کے دو راستے ہیں۔ ایک تو سود لاگت پیداواری میں شامل ہو کر قیمتوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ ایک خیالی مکمل مقابلے والی معیشت میں ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو' لیکن عملی دنیا جس میں مکمل مقابلہ کبھی وجود میں نہیں آتا اور اشیاء کی شکل و صورت' کوالٹی' برانڈ وغیرہ میں فرق کے ذریعہ سے قیمتوں میں فرق ڈالا جا سکتا ہے' وہاں سود لاگت پیداوار میں شامل ہوتا ہے اور نتیجہ قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

چہارم' اس نقطۂ نظر کے حامل لوگ اس کیلئے تیار نہیں ہیں کہ اگر قیمتوں میں کمی ہو جائے تو پھر قرض خواہ کم رقم وصول کرنے کیلئے راضی ہو گا۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ سود سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ یہ بات اب مسلمہ ہے کہ سود اور سرمایہ کاری کا آپس میں الٹا تعلق ہے۔ یعنی سود میں اضافہ سے سرمایہ کاری میں کمی اور سود میں کمی سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا سود سرمایہ کاری کو روک کر اشیاء کی پیدائش پر قدغن لگاتا ہے' جس سے رسد میں کمی آتی ہے اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔[۹]

اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ آج کل افراطِ زر کا سب سے بڑا ذریعہ تو خود حکومتوں کی خسارہ کی سرمایہ کاری (Deficit Financing) ہے' مثلاً پاکستان میں 94-1993 کے بجٹ میں خسارہ کا تخمینہ 34.5 ارب روپے ہے جب کہ اس سال سود کی ادائیگی پر 96 ارب روپے خرچ آئے گا۔ غور کیجئے کہ کل کا کل خسارہ ختم ہو جائے اگر سود کی ادائیگی نہ کرنا پڑے۔ ان 96 ارب روپوں میں 78 ارب روپے تو اندرون ملک سے لئے گئے قرضوں کا سود ہے۔ ان حقائق کی روشنی

میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افراط زر کا سب سے بڑا ذریعہ حلومتوں کا خسارہ اور خسارے کی سب سے بڑی مد سود کی ادائیگی ہے۔ اگر ہم معیشت کو صحیح رخ پر ڈالنا چاہتے ہیں تو سود کی ادائیگی بند کر دیں' اس سے خسارہ یکمشت ختم ہو جائے گا' بلکہ تقریباً 61 ارب روپے مزید بھی بچ رہیں گے جن سے ہم دوسرے مفید کام کر سکتے ہیں۔ اور اگر فوری طور پر غیر ملکی قرضوں کا سود نہ بھی روکا جا سکتا ہو تو اپنے لوگوں کے سود کو ختم کر کے بھی نہ صرف سارا خسارہ ختم کیا جا سکتا ہے بلکہ 43 ارب روپے بچائے بھی جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آج کل کے حالات میں جب کہ ملکی معیشت سود پر قائم ہے اگر کوئی شخص اپنے قرض پر کوئی اضافہ اس خیال سے مانگے کہ افراطِ زر کی وجہ سے جو کمی اصل زر کی قدر و قیمت میں ہوئی ہے اس کو پورا کیا جا سکے تو اس پر شرعی طور پر کیا اعتراض ہے' تو جواب یہ ہے کہ اس طرح کے اضافے اور سود خوار کے اضافے میں تمیز کیسے کی جا سکے گی' کیسے معلوم ہو گا کہ ایک شخص جو اضافہ لے رہا ہے وہ صرف افراط زر سے نقصان کی تلافی کا معاوضہ ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری بحث محض سود کو جواز فراہم کرنے کیلئے کی جا رہی ہے۔ آج کل بھی جب ہم ایک سودی معیشت میں رہ رہے ہیں ہمارے دوست احباب میں سے کوئی ہم سے اپنی ذاتی ضرورت کیلئے قرض لے تو باوجود افراط زر کے ہم اس سے کوئی اضافہ طلب نہیں کرتے کیونکہ یہ باہمی مروت و اخوت کے خلاف ہے اور یہ بات تمام مہذب معاشروں میں ایسے ہی ہے۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو ذاتی ضرورت کیلئے قرضِ حسن نہ دے لیکن اگر دے تو وہ کچھ زائد نہیں مانگتا۔ رہی بات تجارتی اغراض کیلئے قرضوں کی اور ان پر افراط زر کے نقصان کی تلافی کا سوال' تو اگر ایک شخص کسی دوسرے کو اپنا سرمایہ اس لئے دیتا ہے کہ لینے والا اس سے تجارتی فوائد اٹھالے تو شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ دینے والا' سرمایہ لینے والے سے شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے۔ شرکت یا مضاربت کی

صورت میں اگر قیمتوں میں اضافے کا رجحان بالعموم طور پر ہو تو وہ منافع میں اضافے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کا فائدہ لامحالہ سرمایہ دینے والے کو خود بخود ہو جاتا ہے' لہٰذا اس صورت میں ایک اور اضافہ سود کی شکل میں مانگنا کسی طرح بھی روا نہیں ہو سکتا۔

ج-سود : سرمایہ کے استعمال کا معاوضہ؟

سود کے حق میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ سرمایہ کے استعمال کا معاوضہ ہے۔ کیا حقیقت میں ایسا ہی ہے؟ سرمایہ' زر کی شکل میں پیدا آور نہیں ہے' اسے پیدا آور ہونے کے لئے ضروری ہے کہ یہ اپنی شکل تبدیل کرے' یعنی یہ زر سے کسی طبعی اثاثہ میں منتقل ہو۔ اس صورت میں یہ پیدا آور ہو سکتا ہے۔ کسی اثاثہ کے پیدا آور ہونے سے اس کے استعمال کے ذریعہ اس میں فرسودگی پیدا ہوتی ہے' وہ قدرتی حوادث کا شکار ہوتا ہے' اس کے استعمال کے لئے بعض دوسری لاگتیں بھی لگانا پڑتی ہیں' جیسے کہ مشینوں کے لئے تیل اور بجلی وغیرہ' لہٰذا جب بھی کسی اثاثہ کو استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اثاثہ اپنی اصل میں سے کچھ نہ کچھ ضرور کھو دیتا ہے۔ لیکن زر ایک واحد اثاثہ ہے جس کو "استعمال" بھی کر لیا جائے تو وہ ویسے کا ویسا ہی رہے اور مالک اسے ویسے ہی واپس لینے کے لئے اصرار کرے اور اس پر مستزاد ایک معاوضہ بھی مانگے۔ مادی اثاثہ جات کے استعمال پر ان کے معاوضہ کا حق اس فرسودگی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو ان کے استعمال سے وجود میں آتی ہے' لیکن زر کے سلسلہ میں ایسی کوئی چیز اس کے "استعمال" سے لاحق نہیں ہوتی' پھر اس کے معاوضہ کا مطالبہ کس بنا پر؟ جن اثاثہ جات پر کرایہ جائز سمجھا جاتا ہے' جیسے مکانات' سواری وغیرہ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ اثاثہ جات استعمال سے فرسودگی کا شکار ہوتے ہیں' یہ آفات ارضی و سماوی کا سامنا بھی کرتے ہیں' لہٰذا مالک کو ان کے استعمال کا کرایہ لینے کا حق ہے۔

ضمناً یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ سود کی وجہ سے اشیاء کے کرائے اور منافع کی

شرح میں کسی حد تک ایک استحصالی رجحان اور عدم لچک پیدا ہو جاتی ہے اور اگر سود نہ ہو تو کرایوں اور منافع کی شرحیں بھی معتد بہ حد تک کم ہو جائیں۔ اس معاملہ کو اس دلیل سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس ایک لاکھ روپے نقد ہوں اور اسے اس پر 15 فیصد سود گھر بیٹھے مل سکتا ہو' تو پھر وہ شخص اگر ان روپوں سے کوئی عمارت لے لے تو وہ کبھی بھی اس کا کرایہ 15000 روپے سالانہ سے کم لینا پسند نہیں کرے گا' بلکہ وہ اس سے زائد ہی مانگے گا' کیونکہ 15000 روپے تو اسے بغیر کوئی خطرہ مول لئے سود پر مل سکتے ہیں۔ یہی معاملہ منافع کا ہے۔ لیکن اگر معیشت سے سود ختم ہو جائے تو پھر نقد والے کو کچھ نہیں ملے گا۔ اگر کسی نے معاوضہ لینا ہو تو اسے کوئی پر خطر کام کرنا ہو گا جس سے معیشت میں سرمایہ کی رسد بڑھے گی اور شرح معاوضہ کم ہو جائے گی' خواہ یہ معاوضہ کرایہ کی شکل میں ہو یا منافع کی شکل میں۔

د۔ سود بحیثیت آلہ رسد و طلبِ سرمایہ؟

(Interest as a Rationing Device)

سود کے بارے میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ سود معیشت میں سرمایہ کی راشن بندی کرتا ہے۔ جو سرمایہ میسر ہوتا ہے وہ اسے پیداآور کاموں میں لگاتا ہے حتیٰ کہ سرمایہ کی رسد و طلب برابر ہو جاتی ہے۔ اس طرح سود سرمایہ کی قیمت کے طور پر ایک اہم عامل کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ دلیل بھی چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے۔

اول یہ کہ عملی زندگی میں ہم سود کی موجودگی میں بھی طلب و رسد برائے سرمایہ کو برابر نہیں دیکھتے۔ اس کی عملی اور تازہ مثال سابق حکومت کی سکیم برائے روزگار تھی جس میں 17 فی صد شرح سود کے باوجود قرض لینے والے لاکھوں تھے' جب کہ سرمایہ اتنا نہیں تھا کہ سب کو دیا جا سکے۔ اب بھی کسی بینکر کو انٹرویو کر کے دیکھ

لیں ' جتنے لوگ رائج الوقت شرح سود پر قرض مانگ رہے ہیں بینک ان کے ایک بہت قلیل حصہ کو قرض دے سکتے ہیں ' لہٰذا یہ کہنا کہ سود طلب و رسد کو برابر کر دیتا ہے ' غلط ہے۔

' باوجودیکہ بینک قرض دیتے وقت قرض خواہ کی مالی حیثیت اور قرض کے مقصد کو دیکھتے ہیں ' لیکن بے شمار قرض ایسے مقاصد پر صرف ہوتے ہیں جن سے پیدا آوری میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کی بہترین مثال حکومت کے قرضے ہیں جو حکومت مختلف پراجیکٹس کیلئے لیتی ہے۔ قرضہ منظور کرنے سے پہلے بین الاقوامی مالی ادارے مثلاً ورلڈ بینک ' ایشین بینک وغیرہ پورے پراجیکٹ کا معاشی اور مالیاتی تجزیہ کرتے ہیں اور شرح سود کے حساب سے پراجیکٹ کی موجودہ مالیت (Net Present Value) نکال کر اطمینان کرتے ہیں کہ اس پراجیکٹ سے اتنا فائدہ ہو گا کہ رائج الوقت شرح سود پر اسے قرضہ دیا جائے تو یہ پراجیکٹ اپنا قرض خود واپس کر سکے گا ' لیکن عملی طور پر نصف سے زیادہ پراجیکٹ ناکام ہو جاتے ہیں۔ ایشین بینک کی ایک تازہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 1973ء سے 1993ء تک اس کے 40 فی صدی سے زیادہ قرضے ایسے پراجیکٹ کیلئے دیئے گئے ہیں جو نفع آور نہ ہوئے اور ناکام ہو گئے[10]۔ اور ناکام ہونے والے قرضوں پر ضائع ہونے والی رقم 6.4 ارب ڈالر تھی۔ ایسا ہی اعتراف ورلڈ بینک کو بھی ہے[11]۔ سوال یہ ہے کہ اگر سود ایسی ہی جادو کی چھڑی ہے کہ اس کے ذریعے سے سرمایہ کو پیدا آور کاموں کی طرف موڑا جا سکتا ہے تو پھر اس بڑے پیمانے پر پراجیکٹ ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

' اگر ہم اپنے ارد گرد دیکھیں تو سرمایہ عالی شان عمارتوں کی تعمیر اور بہت سے ایسے پراجیکٹ جن کی حیثیت نمائشی ہوتی ہے پر لگتا ہے ' جب کہ معاشرے میں بے شمار غریب اور مفلوک الحال لوگ آباد ہوتے ہیں جو نان جویں کے بھی محتاج ہوں۔ اگر سرمایہ معاشرتی طور پر مفید کاموں میں لگایا جاتا ہو تو پھر یہ عدم توازن

کیوں ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ سود سرمایہ کو مفید جگہوں کی طرف نہیں موڑتا' بلکہ یہ اس کا رخ انہی کاموں کی طرف موڑتا ہے جہاں سے قرض خواہ کو اپنا اصل مع سود ملنے کی امید ہو' خواہ مقصد کیسا ہی ہو۔ یہ سب اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ ہر وقت مقصد کی اولیت کا ورد زبان پر رہتا ہے اور عملی طور پر سرمایہ کے تحفظ اور سود کی وصولی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔

۵۔ سرمایہ کی قدرِ موجودہ اور قدرِ مستقبل کا فرق
(Difference Between Present and Future Value of Capital)

سود کے حق میں ایک بہت بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ سود اصل میں اس فرق کو دور کرتا ہے جو کہ سرمایہ کی قدر موجودہ (Present Value) اور قدر مستقبل (Future Value) میں پایا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں دلیل یوں ہے کہ اگر ایک شخص کسی کو آج 100 روپے قرض دے اور ایک سال بعد واپس لے تو ان 100 روپوں کی موجودہ یا حالیہ قدر' مستقبل کے 100 روپوں سے زیادہ ہے' کیونکہ یہ رقم آج اس شخص کے پاس ہے اور مستقبل غیر یقینی بھی ہے اور پر خطر بھی۔ چنانچہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ ہر شخص کیلئے عام چیزوں کی قدر موجودہ ان کی قدر مستقبل سے زیادہ ہوتی ہے' لہٰذا اگر کوئی شخص اپنا سرمایہ اپنے سے جدا کرتا ہے اور مستقبل میں وصول کرنے پر راضی ہو جاتا ہے تو گویا عملاً اس نے ایک کم تر قدر کی وصولی پر رضامندی کی ہے۔ قدر میں اس کمی کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ اسے ایک رقم سود کے طور پر دی جائے اور اس طرح ان روپوں کی قدر مستقبل کو قدر موجودہ کے برابر کر دیا جائے۔ یہ دلیل اس قدر رائج ہے کہ تمام مالیاتی ادارے اس دلیل کی بناء پر سرمایہ کاری کا معاشی تجزیہ کرتے ہیں اور سرمایہ کا "داخلی معاوضہ" (IRR) نکالتے ہیں۔

ہمارے ملک میں پلاننگ کمیشن میں یہی فلسفہ صحیح مانا جاتا ہے اور اسی کے مطابق معاشی تجزیہ کر کے مختلف پراجیکٹس کو منظور یا رد کیا جاتا ہے۔

اس دلیل میں بہت سی کمزوریاں ہیں:

۱۔ جہاں تک کسی چیز کی قدر موجودہ اور قدر مستقبل میں فرق کا تعلق ہے تو وہ لوگ جو اتنا کماتے ہوں جتنا وہ خرچ کر لیتے ہوں تو ان کی حد تک یہ بات بالکل ٹھیک ہے' کیونکہ ان کے نزدیک ان کی آمدنی کی قدر موجودہ' قدر مستقبل سے زیادہ ہے' لہٰذا وہ حال ہی میں اسے صرف کر کے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ تسکین کا سامان کر لیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مال دار طبقے کا تعلق ہے تو یہ طبقہ اپنی صرفی ضروریات کے بعد جو مال بچاتا ہے تو اس طبقہ کے لئے اس کی قدر مستقبل' قدر موجودہ سے زیادہ ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ وہ بچت کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں جب بھی کہیں ایک روپیہ بچایا جاتا ہے تو وہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس روپے کی حد تک قدر مستقبل' قدر موجودہ سے زیادہ ہے۔ چنانچہ یہی وہ روپیہ ہے جو مارکیٹ میں قرض کیلئے میسر آتا ہے۔ اب اس روپے پر مزید سود ادا کر کے اس کی مستقبل اور حالیہ اقدار کو برابر کرنے کا کیا مطلب؟ اگر برابر ہی کرنا ہے تو پھر صاحب سرمایہ کو چاہئے کہ وہ قرض لینے والے کو اس سرمایہ کی حفاظت کا کچھ معاوضہ دے' کیونکہ وہ اس روپیہ کی قدر موجودہ (جو کم ہے) کو اس وقت واپس کرے گا جب اس کی قدر میں اضافہ ہو چکا ہو گا۔ غرضیکہ زر کی قدر مستقبل اور قدر موجودہ کا مقدمہ محض خلط مبحث ہے۔

۲۔ یہ کہ مختلف پراجیکٹس کے معاشیاتی تجزیہ میں منافع اور لاگت کے تخمینے اور ان پر سود کا شمار سب اندازے ہوتے ہیں' اور بہت سے مفروضات پر مبنی ہوتے ہیں' جو عملی زندگی میں کبھی مرتب ہوتے ہیں اور کبھی نہیں۔ ان مفروضوں پر سود کا شمار کر کے یہ اندازہ لگانا کہ فلاں تجویز سرمایہ کاری نفع بخش ہو گی اور فلاں نہیں' کوئی محکم حکمت عملی نہیں ہے۔

(پنجم) 'اس معاشیاتی تجزیہ میں شرح سود کا تعین بھی کسی معروضی طریقے سے نہیں کیا جاتا' یعنی یہ معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ سرمایہ کاری کی لاگت اور منافع کی قدر مستقبل اور حالیہ قدر میں فرق کس شرح سے کیا جائے اور اس کی کیا وجہ ہو؟

غرضیکہ ' سرمایہ کاری کے فیصلہ کیلئے شرح سود پر مبنی جو معاشیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے وہ کسی محکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

و۔ سود اور بچتیں

بعض لوگ اس خدشہ کا اظہار کرتے ہیں کہ سود' جو کہ بچتوں کا ایک محرک ہے' کے خاتمہ کے بغیر معاشرہ میں بچتوں کی رسد کم ہو جائے گی اور اس طرح سرمایہ کیلئے رقوم کی طلب و رسد میں ایک عدم توازن پیدا ہو جائے گا۔ یہ خدشہ بھی چند ایسے مفروضوں پر قائم ہے جن کی عملی زندگی میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مثلاً یہ مقدمہ کہ "سود بچتوں کا محرک ہے" ایک ناقابل ثبوت مفروضہ ہے۔ بچتوں کے محرک بہت سے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے معاملہ میں اور بعض حالات میں سود کا لالچ بھی بچت کیلئے محرک ہو' لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ لوگ اس وقت بھی بچت کرتے ہیں جب کہ شرح سود منفی ہو' یعنی جب قیمتوں میں اضافہ کی شرح' سود کی شرح سے زیادہ ہو۔ اگر سود بچتوں کیلئے محرک ہوتا تو ایسے حالات میں بچتوں کی شرح صفر ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ ورلڈ بینک کی 1993ء کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ 1991ء میں سولہ ممالک ایسے تھے جن میں شرح سود منفی تھی۔ (یعنی ان ممالک میں شرح افراط زر' شرح سود سے زیادہ تھی) لیکن بچتوں کی شرح اضافہ مثبت تھی[۱۲]۔ اس کے علاوہ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں بہت سے ایشیائی و یورپی ممالک میں اور خود امریکہ میں بعض سالوں میں شرح سود منفی رہی' لیکن بچتوں میں اضافہ کا رجحان بدستور رہا۔۔۔۔ اگر شرح سود اور بچتوں کا تعلق وہ ہوتا جو اس مقدمہ میں بیان کیا جاتا

ہے تو بچتوں میں کمی ہونا لازم تھی۔

اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ کینز (Keynes) نے اپنے نظریہ میں یہ بات ثابت کی کہ بچتوں اور شرح سود کا آپس میں معکوسی تعلق ہے' یعنی اگر شرح سود زیادہ ہو تو بچتیں کم ہوں گی اور شرح سود کم ہو تو بچتیں زیادہ۔ اور اس کی دلیل بھی بہت سادہ ہے' وہ یوں کہ شرح سود' سرمایہ کاری پر قدغن لگاتی ہے' جس سے سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے' جس سے آمدنیوں میں کمی آتی ہے' جس سے بچت میں کمی ہوتی ہے۔ لہٰذا جوں جوں شرح سود کم ہوگی' سرمایہ کاری میں اضافہ ہوگا' آمدنیوں میں اضافہ ہوگا اور بچتوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ چنانچہ اگر ہم پاکستان ہی کے اعداد و شمار دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ 1965ء میں پاکستان میں بچتوں کی شرح 13 فی صدی تھی جب کہ شرح سود 5 فی صدی تھی اور 1985ء میں بچتوں کی شرح 5 فی صدی رہ گئی جب کہ شرح سود 16' 17 فی صدی تھی[۱۳]۔

غرضیکہ یہ مقدمہ کہ "سود بچتوں کے لئے ایک محرک ہے" معاشی طور پر قابل دفاع نہیں ہے۔ یوں بھی اگر دیکھا جائے تو یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ اگر سود ختم ہو جائے تو لوگ اپنی زائد آمدنی کو تکیوں کے غلافوں یا زمین دوز گڑھوں میں رکھنا شروع کر دیں گے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ان کی یہ بچتیں کسی نہ کسی بینک کا رخ کریں گی جہاں سے وہ سرمایہ کاری کیلئے میسر آئیں گی۔ اس طرح سے سرمایہ کی طلب و رسد کا وہ توازن جس کے لئے سود کو ایجاد کیا جاتا ہے قائم ہو جائے گا' خواہ سود نہ بھی ہو۔

ز۔ سود اور مواقع سرمایہ کاری کی لاگت
(Opportunity Cost)

سود کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ جب کوئی شخص اپنا سرمایہ کسی دوسرے کو دیتا ہے تو وہ گویا مستقبل کے ایسے مواقع جو اسے خود میسر آسکتے تھے' جن

کے ذریعہ وہ اس سرمایہ سے کچھ کما سکتا تھا' سے دست بردار ہو رہا ہوتا ہے' چنانچہ اس ایثار کی وجہ سے مقروض کو چاہئے کہ وہ دائن کو سود کی شکل میں کچھ زائد رقم لوٹائے۔ سود کے حق میں یہ دلیل اول اول اس زمانے میں پیش کی گئی جب عیسائی چرچ سود کے سخت مخالف تھا۔ اس پر بعض لوگوں نے ایک قدرتی مجبوری کے طور پر اس نظریہ کو پیش کیا اور بعض پادریوں نے اس کے اندر کچھ معقولیت دیکھی اور سود کی اجازت دی' جس کے نتیجے میں پھر سود اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ معیشت میں داخل ہو گیا۔

اس دلیل میں سقم یہ ہے کہ یہ دو اشخاص کے درمیان قرض حسنہ کے لین دین اور بینک اور عام آدمی کے لین دین کے معاملہ کو یکساں سمجھتی ہے۔ ایک شخص اگر کسی بینک سے کوئی رقم قرض لیتا ہے تو بینک کو ہر وقت یہ اختیار ہے کہ اپنی رقم واپس لے لے' اگر بینک کو اس سے بہتر تجارت کی کوئی شکل درپیش آتی ہے۔ اس طرح سے اگر کسی شخص نے بینک میں کوئی رقم رکھی ہوئی ہے تو وہ بھی جب چاہے بینک سے اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔ ان صورتوں میں کسی موقع کے ضائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اول صورت میں جب بنک کسی کو کوئی رقم قرض دیتا ہے تو وہ اسی لئے دیتا ہے کہ بینک کے پاس وہ رقم فالتو ہوتی ہے اور بینک کے لئے کوئی دوسرا موقع بھی تو ایسا ہی ہو گا کہ کوئی دوسرا شخص رقم ادھار لینے آئے گا۔ اور قرض حسن کی شکل میں دونوں مواقع برابر ہیں۔ بینک کوئی اور کام تو کرتا ہی نہیں۔ جہاں تک ایک بچت کنندہ کا بینک میں رقم رکھنے کا تعلق ہے تو اگر اس شخص نے بینک میں اپنی رقم رکھی ہو' خواہ وہ مقررہ مدت ہی کے لئے ہو' تب بھی اگر اسے کوئی نفع بخش موقع میسر آتا ہے تو وہ بینک سے اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔ اس میں کسی موقع کے ضائع ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ پھر اس کے معاوضہ بشکل سود کی کیا گنجائش؟

(جاری ہے)

حواشی

۱ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو

Khan, Muhammad Akram, Islamic Economics : Annotated Sources in English and Urdu (2 Vols) Leicester : The Islamic Foundation, 1983, 1991.

۲ ملاحظہ ہو

Federal Shariah Court Judgement on Riba, Lahore : Pakistan Legal Division, 1992.

۳ ایضاً

۴ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو

Kazmi, Akdas Ali, "The non-equivalence of Interest and Riba," Business Recorder, Karachi, 14 May 1992.

۵ تاریخی شواہد کے لئے ملاحظہ ہوں:

مفتی محمد شفیع' مسئلہ سود' ادارۃ المعارف کراچی' ۱۳۹۰ ہجری

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' سود' اسلامک پبلیکیشنز لاہور' ۱۹۶۱ء

محمد یوسف الدین' اسلام کے معاشی نظریئے (دو جلدیں) مکتبہ ابراہیمیہ' حیدر آباد دکن ۱۹۵۰ء

Qureshi, A.I. Islam and the Theory of Interest, Lahore: Sh. Muhammad Ashraf, 1961.

Crone, P., Meccan Trade and the Rise of Isalm, Oxford: Basil Blackwell, 1987.

Udovitch, A.L., Partnership and Profit in Medieval Islam, New Jersey : Princeton University Press, 1970.

O' Leary, De Lacy, History of Arabia Before Muhammad, Lahore: Alliance Publishers, 1989.

۶ ملاحظہ ہو' غیر مطبوعہ کتاب:

Ahmad. Sh. Mahmud, Man and Money, Chapter 3 p.20.

۷ ایضاً

۸ ملاحظہ ہو

Fischer, S. "Indexation," in Greenworld, D., (ed.) Encyclopaedia of Economics, New York : Mc Grave-Hill Book Company, 1980 Pp 499-503.

۹ لارڈ کینز نے اس نکتہ کو بہت وضاحت سے ثابت کیا۔ اب معاشیات دانوں کے درمیان سود اور سرمایہ کاری کے معکوس تعلق پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۱۰ یہ رپورٹ ۱۱۔۱۵ مئی ۱۹۹۲ء کے درمیان کوالالمپور میں منعقد کی گئی ایک کانفرنس بعنوان
Regional Seminar on Performance Evaluation in Asia and the Pacific
میں بانٹی گئی۔ مصنف ہذا کو اس سیمینار میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

۱۱ اس موقع پر ورلڈ بینک کے نمائندے کی طرف سے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا۔

۱۲ ملاحظہ ہو
World Development Report 1992, Washington, D.C: World Bank, 1992.
(شماریاتی گوشوارے)

۱۳ پاکستان کے موجودہ اعداد و شمار دینا اس لئے مشکل ہے کہ سرکاری طور پر پاکستان میں سود ختم ہو چکا ہے' لہٰذا شرح سود شائع نہیں کی جاتی۔ مقالہ کے متن میں دیئے گئے اعداد و شمار ورلڈ بینک کی ۱۹۸۵ء کی رپورٹ سے لئے گئے ہیں۔

بقیہ: حکمت اقبال

زندگی ہے' آبِ حیات ہے' جس کے بھٹکنے سے اور دوبارہ راہِ راست پر آنے کے بغیر انسانی معاشرہ کے اندر ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں' انسانیت ارتقاء کے راستہ سے ہٹ جاتی ہے' خودی کی نشوونما رک جاتی ہے اور اس کی آئندہ کی زندگی برباد ہو جاتی ہے' اس نے خدا کی اسی آرزو کو اس کے اصل مقصود سے ہٹا کر عارضی جسم کی غیر محدود خواہشات میں الجھا دیا ہے اور اس طرح سے ان لوگوں کی آخری ناکامی اور نامرادی پر مہر لگا دی ہے جو اس کے پیچھے چلیں گے۔ کیا ہم خودی کے ابدی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کارل مارکس کے برپا کیے ہوئے روسی نظام کو تہذیب یا دانائی کی بات کہہ سکتے ہیں؟

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

دعوتِ فکر

حضرت عیسیٰؑ کے انقلابی افکار

مسیحی برادری کی توجہ کے لئے

—— تحریر : صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی ——

اہلِ اسلام کا وحی اور تاریخ کے مصدقہ اور معتمد علیہ نصوص اور شواہد کی بناء پر یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ پہلا اور آخری دین اور عالمِ انسانی کی جامع اصلاح اور فلاح کا واحد راستہ "اسلام" ہے۔ یہی وہ دین ہے جس کی تبلیغ و ترویج حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جملہ انبیاءِ سابقین نے کی' اسی دین کے اعلان و اظہار کے لئے ختمی مرتبت ﷺ مبعوث کئے گئے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر تمام انبیاء اپنے اپنے دور میں چلتے رہے اور اپنی امت کو اس راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ اسی دین کی تکمیل آنحضور ﷺ کے عہدِ نبوت میں ہوئی اور اب نہ کوئی دوسرا دین ہو گا' نہ کوئی دوسرا نبی آئے گا' اور نہ ہی کوئی دوسری امت تشکیل پا سکے گی۔ اسلام سے باہر کے تمام راستے اعتزال اور انحراف کے راستے ہیں۔ اسی اصولی عقیدے کی بنیاد پر امتِ مسلمہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے نبی (ﷺ) پر ایمان کے ساتھ ساتھ جملہ انبیائے سابقین (علیہم السلام) پر ایمان لانے کی مکلف اور پابند ہے' خواہ اس نبی کے بزعمِ خویش امتی اور پیروکار مسلمانوں کے پیغمبر کے بارے میں کیسا رویہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ مسلمانوں کی چودہ صدیوں کی تاریخ اس امر پر شاہد عادل ہے کہ یہودی اور مسیحی برادری کی طرف سے پیغمبرِ اسلام ﷺ پر مختلف زاویوں سے تنقید بلکہ توہین کے باوجود نہ زبانی اور نہ تحریری ایک بھی جملہ اہلِ اسلام کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے خلاف صادر نہیں ہوا۔ یہ محض عالمی ردِّ عمل سے بچاؤ اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی دلجوئی کے لئے نہیں بلکہ اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے ہے' کیوں کہ ایک مسلمان رسول اکرم ﷺ پر جان

چھڑکنے کے باوجود اس وقت دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے جب وہ کسی بھی دوسرے نبی کی صراحۃً یا کنایۃً توہین یا انکار کا مرتکب ہو۔ اس عقیدے میں اسلام کے اس مشترکہ ورثے کا دخل ہے جو عہد بہ عہد پہلے نبی سے آخری نبی (علیہم السلام) تک ایک دوسرے کے ہاں منتقل ہوتا رہا اور یہی ورثے کا اشتراک دراصل انسانیت کے درمیان دین کا اشتراک ہے جسے بدقسمتی سے افتراق میں بدل دیا گیا۔

عہدِ قدیم میں بیک وقت مختلف علاقوں میں متعدد انبیاء دینِ اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور ان کے پیروکاروں کے درمیان معمولی کدورت' رنجش' جھڑپ یا مسابقت کا ایک بھی مدھم سا نشان تاریخ میں نہیں ملتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پیش رو نبی اپنے جانشین نبی کے لئے اپنی امت کو اس کی نصرت' حمایت اور اطاعت کا حکم دیتا رہا۔ تا آنکہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ نے نبوت کے اس سنہری سلسلے کو مکمل کر دیا اور اپنی نبوت کی تصدیق کو جملہ انبیائے سابقین کی تصدیق کے ساتھ مشروط کر دیا اور نبوت اور رسالت کے نام پر انسانیت کے درمیان کسی بھی نوع کی تفریق' تقسیم اور تحزّب کے تمام راستے بند کر دیئے۔ خود عہدِ رسالت میں یہود و نصاریٰ کا رویہ انتہائی سوقیانہ رہا لیکن حضور ﷺ نہ تو خود کسی منفی ردعمل کا شکار ہوئے اور نہ اپنی جماعت کو کسی طرح کے تعصب اور تحزّب کی ہوا لگنے دی۔ اس سارے معاملے کی ایک جوہری وجہ یہ بھی ہے کہ نبوت کا منصب کسی سیاسی پارٹی کے سربراہ کا منصب نہیں اور نہ ہی کسی برادری کے سرپنچ کا! جہاں دوسری پارٹیوں سے اختلاف اور دوسری برادریوں سے نفرت کے بغیر یہ عہدہ باقی رہتا ہے اور نہ پارٹی اور برادری کا تشخص۔ بلکہ نبوت خالصتاً الٰہی پروگرام کی تکمیل کا منصب ہے جو اپنے احاطے میں پوری بنی نوع انسان کو لئے ہوتا ہے اور نوع انسانی نام ہے کالے اور گورے کا' شرقی اور غربی کا' عربی اور عجمی کا' شہری اور بدوی کا' امیر اور غریب کا' ایشیائی اور افریقی کا' اور ہر اس شخص کا جو اولادِ آدم ہے۔ چنانچہ دائرۂ نبوت میں کسی کشمکش' کسی مغائرت' کسی حسد' کسی مسابقت' کسی تردید اور کسی مشاجرت کا کوئی امکان نہیں۔ اس لئے نبوت کے پورے سلسلے میں ایک بھی کڑی کہیں ٹوٹی ہوئی یا الجھی ہوئی نظر نہیں آتی۔ ہماری اس فلاسفی پر تاریخ کے دور اور نزدیک کے تمام گوشے برابر روشنی ڈال رہے ہیں۔

لیکن بعد میں کیا ہوا؟ اس کی بھی ایک تاریخ ہے جس سے ہر اہلِ علم باخبر ہے۔ جب تک تو "اسلام" بطور "دین" رہا' خیر اور نصح کے جذبے کے ساتھ تمام معاملات چلتے رہے' لیکن یار لوگوں کو جب فرقے اور گروہ سوجھے تو کوئی یہودی بن بیٹھا اور کوئی عیسائی' اور خود اپنے انبیاء کی تعلیمات کو اپنی خواہش اور مفاد کے قالب میں ڈھال لیا۔ آج جو مذہبی خانے میں مذہب کے اندراج پر احتجاج اور گستاخِ رسول ﷺ کی سزا پر اعتراض ہوتے ہیں' یہ سب اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔ اس سب کے باوجود کوئی مسلمان کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بھی حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے نبی ہونے پر شک کا اظہار کرتا ہے اور نہ ان کی شخصیت پر کوئی اعتراض۔ بلکہ اگر دل میں بھی برا سوچے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس کی یہ سوچ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی جوہری تعلیم کے منافی ہے۔ اگر دینی جذبے اور اخلاصِ نیت کے ساتھ اسلامی انقلاب کے فلسفے کا مطالعہ کیا جائے تو عیسائیوں اور یہودیوں کو اہل اسلام کے دوش بدوش ہو کر اس اسلام کے غلبے کے لئے کام کرنا چاہئے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا دین رہا ہے اور اسی دین کی حقانیت کے لئے حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور آل فرعون سے ٹکر لی اور حضرت عیسیٰؑ انہی کوششوں کے باعث شرپسندوں اور باطل پرستوں کے ہاتھوں تختہ دار تک پہنچائے گئے' لیکن (مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق) وہ خدائی سکیم کے تحت بچ گئے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ نبوت کے عہدِ وسطیٰ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کی شریعت کا وہی عہد تھا جو ختم ہو گیا اور حضرت عیسیٰؑ خود اپنے قول کے مطابق "بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش" میں رہے' اس لئے ان کا دور بھی نہ رہا جبکہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے پیش رو تمام انبیاء کی جزوی کوششوں کو بتمام و کمال نتیجہ خیز بنایا' ان کی علاقائی جدوجہد کو عالمی رنگ بخشا' ان کی قومی دعوت کو بین الاقوامی دعوت کے قالب میں ڈھالا' ان کی وقت کی آواز کے ساتھ مشروط تبلیغ کو ابدی حیثیت اور ہمہ گیر نوعیت عطا کی۔ اس لئے آپ ﷺ کا مشن اب عالمی' آپؐ کا پیغام اب بین الاقوامی اور آپؐ کی دعوت اب بنی نوع انسان کی دعوت کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا اب ان تمام لہروں کو ایک دھارا بننا چاہئے اور عالمی اسلامی انقلاب کا مخلص کارکن بن کر اس "اسلام" کو پوری دنیا کا دین بنانا چاہئے جس کی تبلیغ اپنے

اپنے عہد میں موسیٰؑ و عیسیٰؑ کرتے رہے۔ قرآن مجید سے ہٹ کر بھی اگر ان دو جلیل القدر پیغمبروں کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو بعد کی تحریفات کو حذف کر کے باقی وہی کچھ ہے جو پیغمبرِ آخر الزمان ﷺ نے کہا اور کیا۔

اِس وقت ہمارے پیش نظر مسیحی برادری کو مخاطب کرنا ہے جو بوجوہ ان لوگوں کا آلۂ کار بنتی نظر آ رہی ہے جنہیں سرے سے کسی مذہب اور دین سے آگہی اور وابستگی نہیں بلکہ وہ دین اور مذہب کو آثار قدیمہ کا درجہ دیتے ہیں جنہیں جھاڑ پونچھ کر تو رکھنا چاہئے لیکن زندگی میں داخل ہونے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ مسیحی برادری اپنی توانائیاں یوں ضائع نہ کرے بلکہ وہ بھی اہل اسلام کے ان انقلابی افراد کی ہم سفر بنے جو مروّجہ سیاست کی فریب کاریوں اور موجودہ فرقوں کی فتویٰ بازیوں سے دور بلکہ نفور ہیں۔ ایسے افراد کی رائے میں اس وقت مسئلہ "اپنی بھیڑوں کے بچاؤ" کا نہیں' بلکہ اس باڑھ کی حفاظت کا ہے جو کسی طرح محفوظ نہ رہ سکی تو انسانی دنیا بھیڑیوں کے جبڑوں میں چلی جائے گی۔ ایک نہیں کئی بھیڑیے خونیں دہانے کھولے ہنکار رہے ہیں' استعمار کا بھیڑیا' ظلم کا بھیڑیا' جرم کا بھیڑیا' ہوس کا بھیڑیا' نفرت کا بھیڑیا' رنگ و نسل اور زبان کا بھیڑیا' بارود کا بھیڑیا' ہولناک کشیدگی کا بھیڑیا' انسان پر انسان کے کنٹرول کی خواہش کا بھیڑیا' خود بیزاری اور مردم آزاری کا بھیڑیا' آخر کس کس بھیڑیے کا نام لکھا جائے۔

حضرت انسان کی جان اور آبرو کا صرف اسی ایک صورت میں بچنے کا امکان ہے کہ وہ ان معصوم اور پوتر' خدا کے محبوب' زمانے بھر کے محسن' ذاتی آلائش اور جذبۂ ستائش سے بالا' بندگیٔ رب اور محبتِ آدم کا درس دینے والے انبیاء کرام کی تعلیمات کو بے میل اور بے لوث طریقے سے سمجھے اور انہیں روبہ عمل لانے کا جتن کرے۔ اس لئے کہ نبوت کی فکر کسی خانے میں بٹی ہوئی نہیں سارے زمانے کے لئے ہوتی ہے۔ انہیں خدا کا قرب بندوں سے پیار میں ملنے کا راز معلوم ہوتا ہے' وہ کسی کے حریف بن کر نہیں آئے سب کے دوست بن کر رہے۔ وہ خود کسی پر غلبے کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ عالم پر خیر' نفس پر ضبط' جرم پر رحم' ظلم پر عدل' آزار پر پیار اور حیوانیت پر انسانیت کے غلبے کا پروگرام رکھتے تھے۔ مکر' زر اور جبر کے نمائندوں نے ان میں سے کئی کو دیس نکالا دیا' کسی کو آرے میں

رکھ کر چیرا' کسی کو بن باس پر مجبور کیا' کسی کو زہر دیا' کسی کو قتل کیا اور کسی کو سولی پر چڑھایا۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ مکر' زر اور جبر کے سالخوردگرگ کے ہلتے دانت جڑوں سمیت اکھیڑ لیں تاکہ ان مظلوم انبیاء کی روحوں کو سکون بہم پہنچا سکیں' جنہوں نے صرف اور صرف ہماری خاطر' ہم انسانوں کی خاطر' انسانوں کی آبرو کی خاطر خود کو نمرود کے الاؤ کی نذر کیا' اپنے آپ کو ٹکٹکی پر بندھوایا' اور بنفس نفیس ہجرت کا عذاب سہا۔

حضرت مسیحؑ عہدِ رومتہ الکبریٰ میں مبعوث ہوئے اور اپنے انقلابی پروگرام کا آغاز فرمایا۔ رومی عہد اس لحاظ سے اگرچہ ایک یادگار عہد ہے کہ اس نے قبائلی سرداری کی جگہ باقاعدہ ایک ریاست اور حکومت کی بنیاد رکھی جس میں بین الاقوامی شان جھلکتی تھی' یوں سوچ کا افق اور عمل کا دائرہ بہت حد تک وسیع ہوا' لیکن اس کے بطن سے استعماریت کا منحوس بچہ برآمد ہوا۔ اسی طرح روم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے دنیا کو پہلی بار ایک تحریری دستور اور باقاعدہ نظامِ قانون سے روشناس کرایا لیکن وہ آئین اور قانون اس اعتبار سے ناقص بلکہ باعث شرم تھا کہ اس میں انسانوں کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ جسٹینین جو پہلے باضابطہ آئین کا خالق اور روم کا بادشاہ تھا اس نے اپنے نظام تعزیرات میں سزاؤں کے نفاذ کے لئے طبقاتی امتیاز ملحوظ رکھا۔ جہاں قانون خود بالا و پست میں تفریق روا رکھے وہ معاشرہ کیسے قابل رشک ہو سکتا ہے؟ ایسے آئین کے ہوتے ہوئے متوقع تھا کہ غریب بیچارے پستے اور امراء داد عیش دیتے رہیں' چنانچہ اسی طرح ہوا۔ رومی تہذیب ایک عیاش تہذیب ثابت ہوئی۔ ایسے ماحول میں کہ جب رومیوں کے عیش کدے غریبوں کا مذاق اڑانے لگے' محلات کے چراغوں میں غریبوں کا خون جلنے لگا' فلک بوس بنگلوں میں اینٹ' گارے اور مسالے کی جگہ غریبوں کا پسینہ خون اور ہڈیاں کام آنے لگیں تو اُس وقت حضرت عیسیٰؑ بن مریم کی صدائے انقلاب ابھری اور رومی عیش کدوں کے در و دیوار سے جا ٹکرائی۔ سرکاری فقیہ اور ریاکار فریسی آپ کی مخالفت میں آگے آگئے۔ ایسے ہی لوگوں کے جُبّوں' حُلّوں' عباؤں' قباؤں اور عماموں کی اوٹ میں عہدِ قدیم میں اور آج بھی امراء اور سلاطین اپنا دھندا چلاتے اور عام لوگ اس ڈر سے اف نہ کرتے کہ کہیں ارتداد کا فتویٰ نہ لگ جائے۔

عیسیٰ روح اللہؑ کا خاندان اگرچہ خود معبد اور ہیکل کا خادم اور متولی چلا آرہا تھا لیکن اس بے تاب روح کی حامل بے عیب اور بے لوث شخصیت نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ سیاسی استبداد' انتظامی جبر اور مذہبی ریاکاری کے نقاب کا آخری تار تک نوچ کر دم لیں گے۔ آپ نے معبد اور ہیکل کے توسط سے شاہی ایوان کا قرب حاصل کرنے کے بجائے بحیرۂ احمر کے کناروں پر آباد ملاحوں اور مچھیروں کی بستیوں کا رخ کیا' ان میں روح انقلاب پھونکی' درس حریت دیا اور اس کام کے لئے آمادہ و مستعد بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ریاستی طاقت اور حکومتی وسائل کے مقابلے میں اپنے اور اپنے پیروکاروں کے اندر ضبط' عدم تشدد اور نظم کا وصف پیدا کیا۔ اگرچہ مدمقابل طاقت کے پاس تلوار تھی مگر آپ کی بات اور آپ کے پیغام میں تلوار سے بھی زیادہ کاٹ تھی۔ طبقہ امراء تک جب آپ کے وعظ' خطبے اور درس کے حصے پہنچتے تو وہ غصے' قہر اور انتقام کے جذبات سے تلملا اٹھتے۔ شروع شروع میں امراء اور رؤساء حسب عادت کسی جوابی کارروائی سے گریز کرتے رہے اور یہ سمجھ کر ٹالتے رہے کہ ان ملاحوں' مچھیروں' گھسیاروں اور لکڑہاروں کی جماعت سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ یہ بیچارے ایک دھمکی کی تاب نہیں لا سکتے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ بعض اوقات نمرود کی "خدائی" کا زعم توڑنے کے لئے ایک مچھر ہی کافی ہوتا ہے۔ جناب عیسیٰؑ کی روزمرہ زندگی اپنے انقلابی پروگرام کا جیتا جاگتا مرقع تھی۔ غریبوں کا سا کھاجا' پہناوا اور اوڑھاوا۔ مسکینوں جیسی وضع قطع اور بود و باش' عام لوگوں کی طرح کا رہن سہن اور اندازِ زیست۔ آپ کی ذات میں طمع' جلبِ زر' ہوسِ دنیا' لذت اندوزی' آسائش طلبی اور حبِّ جاہ نام کو نہ تھی۔ انسانوں سے پیار اور ان کی خدمت آپ کا نمایاں وصف تھا۔ قریہ قریہ گھوم پھر کر ضرورت مندوں کی خبر گیری کرتے' بیماروں کی مزاج پرسی اور دردمندوں کی غمخواری فرماتے۔

آپ کی بے لوثی' بے غرضی اور جرأت رنگ لائی' سینکڑوں ہزاروں دل انقلاب کی تپش سے آشنا ہو گئے' لوگوں کے ضمیر اور ذہن چمک اٹھے' بیسیوں افراد اپنا سب کچھ تج کر آپ کے حواری بن گئے۔ تاریخ کی مکروہ روایت کے مطابق کوئی وڈیرہ' تمن' خان' نواب' زمیندار' چودھری' سرکاری اہلکار اور مراعات یافتہ شخص آپ پر ایمان نہ لایا۔

آپؐ کے جاں نثاروں میں کوئی مچھیرا تھا اور کوئی رنگساز' کوئی باربردار قلی اور کوئی گھسیارا تھا' کوئی چمڑا رنگنے کا کام کرتا تھا اور کوئی چرواہا تھا۔

آپ کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دولت مندوں کی خرمنِ ہوس پر برق بن کر گرتا۔ آپ کا وعظ ان لوگوں کی رگوں میں نشتر بن کر چبھتا جن کے ایک ایک ریشے میں حرام خون اور فاسد مادہ بھرا ہوا تھا۔ آپ کے خطبے مترفین کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح داخل ہوتے۔ آپ کے شعلہ فشاں مکالمے اربابِ اقتدار کے لئے موت کے سندیسے ہوتے۔ آپ کے درس کی طوفانی لہریں گھٹیا مفاد' مریض سوچ' اپاہج نظام اور غلیظ روایات کو بہا کر لے جاتیں۔ آپ کے خطبات و ارشادات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا پرست آپ کو پھانسی دینے کے منصوبوں کے علاوہ کیا سوچ سکتے تھے؟ کہ لفظ آگ برساتے' لہجہ شعلے اگلتا' حرف چنگاریاں بھڑکاتے' انداز طوفان اٹھاتا' آہنگ قیامت برپا کرتا اور پیغام ہلچل مچاتا تھا۔ آپ کی نظر کسی زر پرست پر پڑتی تو فرماتے:

"اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہوں۔" (انجیل)

احبار و رہبان کی حکومت نواز' عوام دشمن اور ریاکارانہ روش کے خلاف آپ ہمیشہ سراپا احتجاج رہے۔ آپ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور بآواز بلند ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیوں کہ نہ آپ اس میں داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بناتے ہو۔

اے اندھے رہنماؤ! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں' لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا۔ اے احمقو اور اندھو! کون بڑا ہے؟ سونا یا مقدس؟ جس نے سونے

کو مقدس کیا!

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف زیرے پر دھمکی دیتے ہو اور (جبکہ) تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف' رحم' اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔

اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو۔" (انجیل)

آپ کبھی انقلاب کا صور۔ یوں پھونکتے :

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاستوں سے بھری ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

اے سانپو! اے سانپ کے بچو' تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟" (انجیل)

(یہ جملہ اقتباسات' متی باب ۲۳' اور آیات ۱ تا ۳۶ سے لیے گئے ہیں۔)

کبھی آپ اپنے کارکنوں کو تلقین فرماتے:

"دیکھو یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو' لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھاوے کے لئے کرتے ہیں' وہ بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں' اپنی پوشاک کے کنارے چھوٹے رکھتے ہیں' ضیافتوں میں صدر نشینی اور معبدوں میں بلند و بالا کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور خود کو ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

بہرکیف حضرت مسیحؑ نے اپنے حیات بخش پروگرام کے ذریعے معاشرے میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد کئی صدیوں تک لوگوں کے لئے عمدہ سیرت و کردار کا نمونہ بنے رہے۔ آپ نے بیک وقت روم کے حکمرانوں کی شہ خرچیوں' یہودی فریسیوں کی ابلیسی چالوں' اور طبقہ امراء کی خرمستیوں کے خلاف جہاد کیا' اسی جہدِ مسلسل اور مثبت

اور حیات آفریں اقدام کا نتیجہ تھا کہ روم کے عظیم فرمانروا اس تحریک اور دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکے اور خود عیسائی مذہب اختیار کر لیا' لیکن یہی روم بعد میں دین و مذہب سے بیگانہ ہو کر ظلم و جبر اور لہو و لعب میں مبتلا ہو گیا اور رفتہ رفتہ ہوسِ ملک گیری کا اسیر بن کر اردگرد کے پڑوسیوں کے لئے شامت بن گیا اور ایک عرصے بعد اس کی استعماری نخوت اور خودسری کا خاتمہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ہوا۔

حضرت عیسیٰؑ کے ان انقلابی افکار اور حضور ﷺ کی مقدس تعلیمات میں سرِمو فرق نہیں' نہ لفظوں کا اور نہ لہجے کا! ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں فکر کا یہ تسلسل دراصل دلیل ہے ایک ہی ذریعۂ علم کی اور وہ ہے وحیِ الٰہی۔ اور الٰہی مشن فی الحقیقت انسانیت کی دنیوی اصلاح اور اخروی فلاح کا مشن ہے جس کی تکمیل میں ہر نبی اور رسول نے حصہ لیا اور آخری نبی ﷺ نے اس کی تکمیل فرمائی

مسیحی برادری کو چاہئے کہ علم و فضل اور معلومات و ابلاغ کے اس دور میں وہ اپنے درمیان کے فقیہ اور فریسی پہچانیں جو انہیں اسی دجل و تلبیس سے گمراہ کئے ہوئے ہیں جس طرح زمانہ قدیم میں احبار و رہبان نے عوام کو کر رکھا تھا اور لاکھوں لوگ سرچشمۂ ہدایت اور رسولوں کی قیادت سے محروم ہو گئے۔

مسئلہ اِس وقت گروہی نوعیت کے مفادات اور تشخصات کے حصول اور استحکام کا نہیں بلکہ مذہب (دین) کو ایک انقلابی قوت کے طور پر اربابِ زر و جاگیر اور اعیانِ سلطنت اور ان کے اعوان و انصار کے خلاف استعمال کر کے صالح انقلاب برپا کرنے کا ہے جن کی دسیسہ کاریوں اور بداعمالیوں نے معصوم بچوں تک سے ان کی معصومیت چھین لی ہے اور ہر فردِ بشر کو اسیرِ ہوس اور شیدائے جرم بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیا ہم چاہیں گے کہ ہم ایک ہوس پرست مجرم' سنگدل' خائن اور بے رحم نسل کے پیش رو کہلائیں؟ ہرگز نہیں۔

چند مچھلیوں نے پورا جل گندا کر رکھا ہے' ورنہ انسان کے ہاتھ میں آج بھی نبوت کی شمع ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی فلاح کا راستہ ڈھونڈھ سکتا ہے اور خدا کسی راہ ڈھونڈنے والے کو منزل سے محروم نہیں کرتا۔

3) How, then, (will the sinners fair on Day of Judgement) when We shall bring forward witnesses from within every community, and bring thee (O Prophet!) a witness against them? (An-Nisaa: 41)

To sum up, the real mission and purpose of prophecy and prophethood is that, through preaching, admonition, advice, dissemination, greeting and warning, God's chosen messengers, establish a peremptory *hujjat* for man's accountability. The cover term for the entire prophetic activities is bearing witness to the Truth before men or "*shahadat alan-nas*." And that, too, is the foremost purpose of the advent of Prophet Muhammad (SAW). The Prophet is addressed in the Quran thus:

O Prophet! Behold! We have sent thee as a witness (to the Truth) and as a herald of glad tidings and a warner, and as one who summons (all men) to God by His leave, and as a light-giving beacon. (Al-Ahzab : 45-46)

This means that, like all other Prophets and Messengers of God, Prophet Muhammad (SAW) was a preacher, teacher, moral and spiritual mentor, a warner, a bearer of glad tidings and witness of Truth—though even in these aspects of the prophetic call, each Prophet had his own mark of distinction in any one of these. The truth of the matter, however, is that the loftiest and most distinguished position among all the Prophets is occupied by Prophet Muhammad (SAW) in whom prophethood not only reached its zenith and plenitude, it also ends with his advent. The splendour and magnificence of his prophetic mission is typically distinct and unique, as will be made clear in the sequel.

(To be Continued)

* * *

these, it invites them to deliberate over its own signs i.e., its Divinely inspired verses or *Aayat* (literally meaning 'signs' of God, because like signs of God, Quranic verses too turn man's mind to the Almighty). In effect, this means that with the aid of the Quran, full and intense awareness of Absolute Reality springs up to man's consciousness like the memory of a forgotten thing shooting up from the depths of the psyche to the surface of mind.

The upshot of the ideas expressed in the above lines is that, through prophets and revealed books, an external witness for or against men is established. God in His infinite mercy has sent His envoys and books in order to reinvigorate the innate ethical perception of mankind and to facilitate moral choice and motivation. From every community a "Witness", i.e., the prophet sent to them will be brought forth as a prosecution witness on the Day of Judgement (cf. An-Nahl: 84,89 and Al-Qasas :75). Prophet Muhammad (SAW) is told by the Almighty that he is only a "warner" , "a reminder" : 'your task is only to preach'; 'you are not a warden over them.' That is why the vocation of prophethood has been described at many places in the Quran under the wide term of "bearing witness to the Truth before men"—*shahadt-i-haqq*—in this world and in the world-to-come. The following Quranic verses substantiate it fully.

1) (Oh!) We have sent unto you an envoy (messenger) who shall bear witness to the Truth before you, even as We sent an envoy into Pharaoh (Al-Muzzammil:15)

2) .....so that the Prophet might bear witness to the Truth before you, and that you might bear witness to it before all mankind. (Hajj: 78)

2) O Man! We did not bestow the Quran on thee from on high to make thee unhappy, but only as an exhortation to all who stand in awe of God. (Ta Ha: 1-3)

3) Nay, verily, these (revealed messages) are but a reminder. (Abasa :11)

4) Thus offering an insight and a reminder unto every human being who willingly turns unto God. (Qaf : 8)

5) In this, behold! there is indeed a reminder for everyone whose heart is wide-awake, that is, (everyone who) lends ear with a conscious mind. (Qaf : 37)

6) And so, (O Prophet!) exhort them; thy task is only to exhort; thou canst not compel (to believe). (Al-Ghashiyah : 21-22)

Tazakkur and its derivatives are very significant Quranic terms which mean recalling to mind the fundamental truths intuitively recognized and apprehended by the primordial human nature (*fitrah*). In essence, *tazaukkur* pertains to the first stage in the comprehension of divine realities and meanings. It also alludes to the truth that the Quranic teaching is not extraneous or heterogeneous to human nature. It actually reflects the experiences of man's true inner self and it is meant to awaken reminiscences of something already apprehended rather to import anything altogether new. The Holy Quran appeals to all thoughtful persons and men of discernment and comprehension to think and ponder over the outer universe of matter as well as the inner universe of the spirit, as both are replete with the unmistakable signs of the Almighty Creator. Along with

2) O followers of the Bible! Now (after a long time during which no messenger has come) there has come unto you (this) Our prophet (or envoy) to make the truth clear to you, lest you say, 'No bearer of glad tidings has come unto us, nor any warner' for now there has come unto you a bearer of glad tidings and a warner since God has the power to will anything. (Al-Ma'ida: 19)

From these two Quranic verses it becomes clear that the real purpose and objective of God's envoys and message-bearers has been to establish conclusively and finally man's responsibility to act as God's vicegerent on earth and to follow His guidance in this life, and to leave no scope for excuses on the Day of Judgement. All excuses offered by man for his misdemeanor will be lame and of no avail.

Here the truth may be recalled once again that just as the external motivators and instigators of good and evil have no real power or authority over a human being—they only tempt, tantalize or motivate and inspire—similarly, prophecy and prophethood work as agents of advice and exhortation. That is the reason why at most places in the Quran the function of prophets and message-bearers has been described as heralds of glad tidings and as warners (cf e.g., verse 56 of Al-Kahf). And the oft-used expressions employed for revelation and the Holy Book are *zikr*, *zikra* and *tazkira*, all derivatives of the root z-k-r meaning 'recalling' or 'reminding'. The following six verses from various Surahs bear this out:

1) Behold! it is We Ourselves who have bestowed from on high, step by step, this reminder; and, behold! it is We who shall truly guard it (from all corruption). (Al-Hijr :9)

3) (But,) behold, as far those who say, 'Our Sustainer is God' and then steadfastly pursue the right way, upon them do angels descend (saying:) 'Fear not and grieve not, but receive the glad tiding of that Paradise which has been promised to you. We are your friends (or protectors) in the life of this world and (will be so) in the life to come. (Ha Mim As-Sajda: 30-31).

Peremptory Factor/argument for Islam (Itmam-i-Hujjat or Qat-i-Uzr)

Now, we can easily discuss and expound the last point of the first portion of the subject under discussion. We have observed that although the basic internal motivators of evil and good are already given to man in the form of *latifa-i-nafs* and *latifa-i-ruh*, the really decisive grounds for moral and virtuous conduct are the higher cognitive faculties inherently imbued in *nafs*, inner moral sense and power of spiritual apprehension, on the basis of which man is subject to accountability in the Hereafter. On the side of external and objective impelling factors for evil and good, on the other hand, are respectively Satan (including all Satanic forces) and angels (including all invisible heavenly agents). But the decisive and peremptory role here is played by divine revelation, God's envoys and messengers and revealed books. Together, they constitute a peremptory argument from Allah (SWT) for man's accountability, and leave for him no ground for excuse of ignorance on the Day of Judgement. Collectively, affirmation of all these is known as belief in prophecy or prophethood (*iman bir-Risalat*). We read in the Holy Quran:

1) (We sent all) Prophets as heralds of glad tidings and as warners, so that men might have no excuse before God after the coming of these Prophets; and God is indeed Almighty, Wise. (An-Nisaa: 165)

one regards as error and sin, unless that person wills to be so guided.

With regard to external tempters and motivators of evil, we all know that they are the friends and progeny of Iblis, from amongst both men and jinns. The Quran explicitly states:

> "Indeed, he (Satan) and his tribe (ilk) see you whence you do not see them." (Al-A'raf: 27)

A tradition of the Holy Prophet (SAW), reported by Bukhari, also tells us that like blood that circulates in the whole body, Satan so vigorously influences a man that he almost permeates his entire inner being. In contrast with the all too common knowledge of external agents and motivator of evil, however, what is generally less appreciated is the truth that angels help and provide firmness and strength to true believers in this worldly life. Just like the 'hordes' of Satan who, through their beguiling activity, tempt and motivate a man towards the evil, the pure and holy angels provide inner peace and strength to believers in following the straight path of Islam and in the arduous task of establishing the socio-political order of Deen-i-Islam. Both Allah (SWT) and angels bless and give glad tidings to them, as is borne out by the following verses:

1) He it is Who bestows His blessings upon you, with His angels (echoing Him), so that He might take you out of the depths of darkness into light. (Al-Ahzab: 43)

2) (When your Lord commanded the angels: ' And give firmness unto those who have attained to faith (with these words from Me): ' I shall cast terror into the hearts of those who are bent on denying the truth...' (Al-Anfal: 12)

(*wasawis*) that he was able to reach the sinner's self; and had it not been for an already-existing evil disposition due to lust, anger, superstition or fanciful ideas, these insinuations would have had no effect whatsoever. This, in effect, means that Satan never forces, nor can he force, anyone to do evil but he tries to entice, or tempt his possible victim. His enticement consists in presenting the immediate superficial ends or tantalizations of this worldly life in such a manner that many people are victimized, most of them temporarily but many permanently. The latter are termed by the Quran as the "friends" or the "party" of the Devil. Iblis or Satan is thus more cunning and artful than strong, more deceitful and contriving than forthrightly challenging.

Similarly, on the other side, no preacher of faith—not even Prophet Muhammad (SAW)—could ever convert any person to the true faith of Islam. And, surely, we cannot possibly think of a better and more sincere preacher than our beloved Holy Prophet (SAW). Therefore, we read in verse 56 of Surah Al-Qasas:

> "Verily, thou canst not guide aright everyone whom thou lovest: but it is God who guides whomever He wills; and He is fully aware of all who would let themselves be guided."

According to several authentic Traditions, the above verse relates to the Prophet's inability to induce his dying uncle Abu Talib, whom he loved dearly and who had loved and protected him (i.e., the Prophet) throughout his life, to renounce the pagan beliefs of his ancestors and to profess faith in God's oneness. The Quranic statement, "thou canst not guide aright everyone whom thou lovest" has undoubtedly a timeless import as well; it stresses the inadequacy and inability of all human endeavours to 'convert' any other person, however loving and loved, to one's own beliefs, or to prevent him from falling into what

renders his life an unceasing moral struggle. Man is squarely charged with his efforts to overcome evil because he is unique in the order of creation and has been endowed with highest faculties of head and heart in order to fulfil his mission as God's vicegerent on earth. Moreover, in addition to inner impulses, man does encounter some external agents and prompters both on the side of good and evil. However, the truth that must he appreciated deeply here is that the really decisive role is only of man's own inner decision and choice. That is to say, the real nucleus of initiation and motivation is the subject-self itself. External forces can only partly instigate and motivate either in the direction of virtue and moral probity or in the direction of sin and immorality. Even Satan, the greatest instigator for evil, has no power to force a man to perform an evil deed. Although Satan waylays man from all sides, his machinations fail against really virtuous persons. To be sure, no man is immune from the Devil's temptations—not even the prophets—yet it is within the reach of any true man of faith and will, let alone the prophets, to overcome them. Thus the Quran states:

> "Verily, thou shalt have no power over My creatures—unless it be such as are (already) lost in grievous error and follow thee of their own will." (Al-Hijir : 42)

> "Behold, he (Satan, the accursed) has no power over those who have attained to faith and in their Sustainer place their trust." (An-Nahl :99)

These and some other verses of the Holy Quran clearly assert that Satan cannot force men to commit sin, and will address his erstwhile followers on Day of Judgement thus: 'I had no power at all over you; but I called you—and you responded unto me' (Ibrahim :22). This shows that the real evil emanates from man's own complex of desires, for Satan makes it clear that it is only by means of insinuations

lauded the role of heart in attaining veridical knowledge. They have done so quite rightly because its paramount importance has also been pointed out by the Holy Prophet (SAW) in one of his oft-quoted sayings. He said, "Verily, just like pieces of iron which get rusty if water touches them, hearts also become rusty". Thereupon, his Companions asked him, "We do polish rusty objects, but how can we polish rusty hearts?" He told them that hearts are polished through frequent remembering of death and reading of the Holy Quran."

Men who do not use God-given cognitive capacities and faculties can only be called worse than cattle inasmuch as animals follow only their instincts and natural drives and are not conscious of the possibility or necessity of higher knowledge and moral choice. Animals do see external things, but they do not perceive them meaningfully as items of articulated and theory-loaded knowledge. If a man does not attain the metaphysical knowledge of the Really Real, it means that he is not really using his internal and external senses. Verse 179 of Surah Al-A'raf reads:

".....And men who have hearts with which they fail to grasp the truth, and eyes with which they fail to see, and ears with which they fail to hear. They are like cattle—nay they are farther astray (even less conscious of the right way)."

Though the people, referred to in this verse, have apparently all the faculties of reason and perception, yet they have so deadened them that those faculties do not work in the real sense and they remain misguided throughout their life and go headlong into Hell.

The External Prompters of Good and Evil

As explained above from the Quranic point of view, the inner denizen of man's self is an arena of a ceaseless struggle between evil and good tendencies. It is this deep-seated moral fact that constitutes the eternal challenge for man and

Latifa-i-Qalb

In addition to the above-mentioned faculties of sight, hearing and moral acumen, Almighty Allah (SWT) has also endowed man with *qalb*, the heart, i.e., the faculty of contemplative intuition and seat or organ of religious apprehension. The 'heart' is indeed ablaze with the *nur* (light) of the love and gnosis of God. It also reflects within itself the reality of all true existents and transcendental truths.

The heart is, so to say, a microcosmic reality which contains within itself the reflection of the entire super-sensible Macrocosmos. Whereas *latifa-i-nafs* has been granted the faculties of perceiving, hearing, induction and deduction—the bases of all physical and theoretical sciences—*latifa-i-qalb has* been given the power of inner perception of spiritual verities. Heart, in Quranic epistemology, is symbolically the seat of the true self or repository of soul, of which we may be conscious or ignorant, but which is our true existential, intellectual and so universal centre. Knowledge afforded by heart is totally different from knowledge acquired at the level of *latifa-i-nafs* through external senses and ordinary channels of ratiocination. The heart is, as it were, immersed in the immutability of Being and is, thus, an organ of *ilm-i-ladunni:* knowledge imparted directly by God through intuition and inner perception. It (the *qalb*) is a supersensory organ of cognition in which knowledge of esoteric truths transpires through meditative reflection (*'tafaqquh'* in Quranic terminology). Contemplativity is here stressed more than the sharpness of intelligence. In short, by bestowing upon man the subtle and luminous cognitive faculty of heart, God has conclusively rendered him responsible and accountable for his deeds in the Life after death.

Muslim poets, in general, and mystic poets of Indo-Persia, in particular, have in their poetic compositions

That is to say, on the Day of Judgement one's tongue, hands, feet and skin will bear witness against him as to his actions. It is not what a man will say about himself, or what others say of him, that determines judgement upon him. It is what he is in himself. His own inner personality will betray him or commend him.

The above cited Quranic verses and the brief explanatory notes make the truth crystal clear that man is not, like animals, merely a sentient or instinctive being; rather, he has been made by the Creator into a full-fledged human person—a human being capable of discerning between right and wrong and thus of choosing his way of life. On the basis of this ingrained moral sense, every human being as such is answerable on the Day of Final Reckoning, and is fully liable to punishment or reward. Every individual will have to account for his own deeds personally, and face the trial and the judgement himself. Verse III of Surah An-Nahl reads:

> "(Be conscious, then, of) the Day every human being shall come to plead for himself (alone) , and every human being shall be repaid in full for whatever he has done, and none shall be wronged."

The Holy Quran categorically refutes the Christian doctrine of vicarious redemption as well as the Jewish idea that "the chosen people"—as the Jews consider themselves—would be exempt from punishment on the Day of Judgement. On that day, nobody would be able to help another, nor will there be any possibility of ransom or intercession, as the Quran says:

> "And remain conscious of (the coming of) a Day when no human being shall in the least avail another, nor shall intercession be accepted from any of them , nor ransom taken from them, and none shall be succoured". (Al-Baqarah: 48)

is imbued with moral failings as well as God-consciousness. (Ash-Shms: 7-8)

The connotation of the verb *sawwa* used in the first verse above is that God has endowed human self with inner coherence and with qualities consistent with the functions which it is meant to perform, and thus has adopted it a priori to the exigencies of its terrestrial existence. Moreover, God has implanted a keen moral sense in him: the fact that man is equally liable to rise to great spiritual heights as to fall into utter immorality is an essential and primordial characteristic of human nature as such. In other words, it is this inherent dichotomy of tendencies which gives to every right choice a value and, thus, endows man with moral free-will.

3) Nay! I call to witness the Day of Resurrection! But nay! I call to witness the accusing voice of man's own conscience. (Al-Qiyamah: 1-2)

The Holy Quran speaks of three types of human self, or three states or stages of the spiritual development: *Nafs-i-ammara* (Yusuf: 53) is prone to evil, and, if unchecked and uncontrolled, leads to perdition; *nafs-i-lawwama* which feels conscious of evil and resists it, asks for God's grace and pardon after repentance and tries to amend; *nafs-i-mutmainna*, the highest stage of all, when it achieves full rest and satisfaction in obeying divine commands.

4) Nay, but man shall be an eye-witness against himself, even though he may veil himself in excuses. (Al-Qiyamah: 14-15)

motivations for moral and spiritual excellence and righteousness. Man's real inner personality thus is an arena of long and perpetual pitched battle between the forces of evil and goodness.

The Basic Grounds for Accountability

Almighty Allah (SWT) has not sent man in this universe without any capacities and potentialities to cope with the inner strife of good and evil. He has been imbued with numerous powers and faculties that help him in fighting out the blind and irrational promptings of evil. First, even the lowest element of his personality—the animal self or *latifa-i-nafs* is equipped with very high capacity for perceiving and hearing and still higher faculties of abstraction and thoughtful reflection. There is a world of qualitative difference between the sensory and mental operations of human beings and brute animals. Logical reasoning through induction and deduction and metaphysical speculation and reflection are only the prerogatives of humans. Secondly, human self has been endowed by Allah (SWT) with a moral sense that discriminates between virtue and vice, between moral rectitude and immorality. That is why man's own inner moral self, *nafs-i-lawwamah* in Quranic terminology, is the most authentic moral judge within. Slightest departure from the path of moral rectitude activates this 'self-accusing soul' and the pricks of conscience are immediately experienced by the evil-doer. The following verses of the Holy Quran categorically state these truths:

1) Verily, it is We who have created man out of a drop of sperm intermingled, so that We might try him (in his later life): and, therefore, We made him a being endowed with hearing and sight. (Ad-Dahr: 2).

2) Consider the human self, and how it is formed in accordance with what it is meant to be, and how it

which always prompts man to worldly and immoral pursuits. The Quran calls this self '*nafs-i-ammarah*', i.e., the self which is wont to enjoin evil, an expression for the lowest stage in the spiritual growth of man: the stage where low desires and animal passions rule the mind of man and he succumbs to his carnal desires like a brute. Different baser aspects of this self were pointed out by Marx, Freud, and Adler. Every one of them focussed his attention exclusively on one of the urges and desires belonging to the lower human self. Darwin, too, was not entirely wrong in asserting the human biological evolution which is a fact in respect of the natural development of the earthly part of man.

Latifa-i-Ruh

Diametrically opposed to the above mentioned animal self is that component of man which is his soul or spirit. It is a divine element in man as Almighty Allah has associated it with Himself: "and breathed into him of My spirit" (Al-Hijr: 29, Saad:72) This spiritual element of man totally belongs to the 'realm of Divine directive force' or in Quranic terminology, '*Alam-i amr*' : "Say: the spirit (or soul) is from God's direction" (Al-Aalam: 85). Being strictly of divine origin, it has an inherent, dormant love for, and attraction towards, Allah (SWT), and, consequently, aspires for a communion with Him. In spiritually evolved persons, however, this dormant, tendency becomes very acute and radiates in the form of (as some Sufi Gnostics put it) a "divine spark".

The Internal Strife of Good and Evil

Being a composite of baser animal *nafs* and divine spiritual soul, man can rightly be characterized as a "microcosm" of the whole of being, reflecting and possessing, in the inmost recesses of his selfhood both evil tendencies and higher spiritual aspirations. He experiences within himself lowest drives for evil and vice as well as noblest

of casting doubts on their own objective existence and total ethical nihilism.

An Important Question

At this juncture an important question arises, the right answer to which can explain the logical relation between the Islamic metaphysical beliefs discussed above (i.e., belief in Allah and Hereafter) and the belief in prophethood. The question is : on what basis is man to be judged in the Hereafter; or in other words, on what grounds is man accountable for his deeds on the Day of Judgement?

The most authentic answer to this question, in the light of the Holy Quran, can be very succinctly expressed thus:

Primarily (and essentially), a man is accountable for his deeds on the grounds of natural capacities and higher (spiritual) faculties given to him by Almighty Allah, e.g., power of perception and audition, thought, reflection and intuition—that is to say, the three faculties of *nafs* (self), *qalb* (heart) and *ruh* (spirit or soul).

Secondarily, Almighty Allah has, in His infinite mercy, supplemented the above inherent potentialities of man with heavenly guidance through revelation of books and sending of His Prophets and Messengers, so that men might have no excuse before God on the Day of Judgement: they may not be in a position to plead ignorance. Revelation and prophethood is thus an additional (and external, so to say) factors that make man fully answerable to God for his deeds in the Hereafter. This point, however, calls for a little clarification.

Latifa-i-Nafs

Self or ego is the lowest of all the faculties possessed by man. Considered from this standpoint, man no doubt is only a highly developed animal and belongs to the realm of creation (Alam-i-Khalq). A major part of this self is carnal

who, not knowing or disregarding the ultimate goal and destiny of man, spends his whole life in pursuing worldly means of material sustenance and sexual gratification. Such a man is generally so absorbed in his immediate concerns, particularly selfish, narrow and material gains, that he does not heed the higher ideals and 'end' of life. The Quran allegorically speaks of this man thus:

> "But then, is he who goes along with his face close to the ground (literally, prone upon his face) better guided than he who walks upright on a straight way." (Al-Mulk :22)

That is to say, the man who is ignorant of divine guidance sees only what is immediately beneath his feet and is utterly unaware of the direction his path is taking him to: a metaphor of the spiritual obtuseness which prevents a person from caring for anything beyond his immediate worldly concerns, and this makes him resemble an earthworm that "goes along prone upon his face."

Or else, this man is like a kite which, its thin cord having been cut, is entirely under the pressure of winds. Winds may carry it wherever they like. The Holy Quran expresses this very graphically in these words:

> "For he who ascribes divine qualities to anything beside God is like one who is hurtling down from the sky—whereupon the birds carry him off, or the wind blows him away onto a far-off place." (Al-Hajj :31)

The net result of this total rejection or ignorance of the divine guidance in respect of the whence and whither of man is that he becomes enmeshed in metaphysical doubts and uncertainties, ending up with wholesale agnosticism and skepticism. The logical end-point of this epistemological skepticism often leads some philosophers even to the extent

man's endeavours on earth. "*Al-dunya*" (the immediate objectives, the here-and-now of life), on the contrary, is not just 'this world' but the lower values, the basal pursuits which appear so tempting that most men run after them most of the time at the expense of the higher and long-range ends. The Holy Prophet (SAW) has elaborated this in one of his moving sermons thus:

'I swear by Allah that all of you will die, just as you go to sleep at night. Then you will all be raised again as you wake up in the morning. Then, surely, you will be judged for the deeds you had been doing. You will get reward for good deeds and punishment for the bad ones. It is either eternal and ever-lasting Gardens of paradise or Hell-fire.' (cf. Sermons of the Holy Prophet reproduced in Nahjul Balagha.)

The Relationship of Beliefs in Allah and in the Hereafter

With a little thoughtful reflection one can realize that the Islamic metaphysical belief in the Divine Creator and the eschatological belief in the Hereafter together constitute the total sapiential knowledge of the whence (*mabda*) and whither (*ma'ad*) of man. That is to say, one who upholds these beliefs reflectively and with full consciousness, *ipso facto*, possesses authentic knowledge both about his source or origin and ultimate destiny or destination. The Holy Quran summarizes it in there words:

"Verily we are from Allah and unto Him we return."

As a matter of truth, a man without this absolutely essential knowledge of the whence and whither of humanity is like a passenger, who due to a mishap and head - injury during the journey, neither remembers as to wherefrom he started his journey nor recalls the destination to which he was travelling. One can well imagine the miserable mental plight of that passenger. This exactly is also the plight of one

created in His own image. He then breathed into him out of His own Spirit and made him his vicegerent on earth. In other words, the Holy Quran presents a theomorphic conception of man: he is *homo cum Deo*. The creation of man represents the climax and apex of divine creative process, as the Quran says : "Verily, we created man in the best of moulds, then We debased him (to be) the lowest of the low "(At'teen :4).

Belief in Life Hereafter

The core of this Islamic belief lies in the assertion that the present terrestrial existence of man does not constitute his total life; rather, it is a very short preamble of everlasting life in the Hereafter: a brief preface of the long life-book. Life in this world is merely like a trial or examination period, the reward or punishments of which will be enjoyed or suffered in the Hereafter (*Al-akhira*). Physical death experienced by man in this world does not mean total extinction or annihilation of the individual person; rather, it means transportation from this world to the eternal life in the resurrected world. Immediately after death, the first brief halting station on the way to the Hereafter is *barzakh*, and the ever-lasting life begins after the Day of Judgement or the final accounting of deeds. Resurrection, final reckoning, weighing or scaling of deed-records, torments of hell-fire and joys of the Garden are essential parts of Quranic eschatology which fully elaborate the Islamic belief in the Hereafter. *Al-Aakhira*, the "end" is the moment of truth: "When the great cataclysm comes, that day man will recall what he had been striving for" (Annaziat:34-35) is a typical statement of this phenomenon. It is an Hour when all veils between the mental perceptions of man and the objective moral reality will be rent: "You were in deep heedlessness about this (Hour of self-awareness), but now we have rent your veil, so your sight today is keen" (Attoor:22). Indeed, the essence of the "Hereafter" consists in the "ends" of life (*al-aakhira*) or the long-range results of

Throne "(Al-Isra:42). Nobody from amongst the creatures shares His substantial essence, attributes, rights, authority and privileges. God cannot be regarded as an existent among other existents. In the metaphysical realm, there can be no democratic and equal sharing of being between the Original, the Creator, the Self-Necessary, and the borrowed, the created, the contingent. The Quranic condemnation of *shirk* ("assigning partners to God") has its roots firmly in this metaphysical realm and then issues forth in the political and moral fields.

Surah Ikhlas and many other verses of the Holy Quran most categorically emphasize the oneness and absoluteness of God Almighty:

Say: 'He is one God: God the Eternal, the Uncaused (Absolute) Cause of all being. He begets not, and neither is He begotten; and there is nothing that could be compared with Him. (Al-Ikhlas)

And say: 'All praise is due to God, who begets no offspring, and has no partners in His dominion, and has no weakness, and therefore no need of any aid'—and (thus) extol His limitless greatness (Al-Isra: 111)

.....He allots to no one a share in His dominion and rule.(Al-Kahf: 26)

Almighty Allah (SWT) has created the Universe with a purpose and for a definite period of time. The creation of the Universe is a serious affair, not a sport or triviality: "And We have not created the heavens and the earth and what is therein purposelessly—that is the opinion of those who reject (God) or who are ungrateful" (As Saad: 27; Aal-e-Imran: 191). The non-ultimacy of nature itself proves its destructibility and the Quran tells us that God in His wisdom has created the myriad form of existents for a finite duration of time (only known to Him). At the pinnacle of God's multi-layered creations appears man whom Allah (SWT)

Supreme Creator, in the life hereafter (*akhira*) and in prophethood and revelation. However, what is generally not realized is the fact that these three doctrinal beliefs are very deeply and logically related and, taken together, constitute an indivisible organic unity. Let us try to examine very briefly and schematically the real import of these beliefs and the nature of their mutual relationship.

Belief in Allah

Keeping aside philosophical controversies and theological intricacies, the quintessential claim of belief in Allah is that the entire realm of being and the whole terrestrial cosmic complex is neither eternal nor ever-lasting. Rather, it is both contingent and perishable. In itself, it has no warrant for its own existence and it cannot explain itself. However, there is one such Being as has neither beginning in time nor an end—*Allah*, the proper name for God. It makes no difference whether one calls Him *Allah* or *ar-Rahman* (The Merciful). He is the Creator and Sustainer of the universe and of man, and, particularly, the giver of guidance for man and the supreme judge of his conduct. God's existence can be brought home to those who care to reflect, so that it not only ceases to be an 'irrational' or 'unreasonable' belief but also becomes for them the Master-Truth. He is all-enveloping, literally infinite, and He alone is infinite, absolute and eternal. All else carries in the very texture of its being the hallmark of its finitude and creatureliness. He is the personification of all good attributes like power, majesty and knowledge etc., in the utmost degree. In the very nature of the case, there can be only one God, for whenever one tries to conceive of more than one, only one will be found to emerge as the First and God has said, "Do not take two Gods (for) He is only One" (An Nahl : 15); "God bears witness that there is no God but He" (Aal-e-Imran : 18) "Say (O Muhammad!) if there were other gods besides Him, as these people assert, they would all (necessarily) seek their way to the (one) Lord of the

THE OBJECTIVE AND GOAL OF MUHAMMAD'S PROPHETHOOD IN THE LIGHT OF THE HOLY QURAN

Dr. Israr Ahmad

(Translated into English by: **Dr. Absar Ahmad**)

We Muslims believe that Hadrat Muhammad (SAW)—the best of all human beings—was not just one of the many Prophets, but he was the 'seal of prophets' (*khatam an-nabiyyeen*); he was not just one of the numerous Messengers of Allah (SWT), he was the last and final Messenger (*aakhir ur-rusul*). Prophecy or prophethood not only ends and comes to a close with him, it achieves its final plenitude, consummation and culmination in him. This means that the Arab Prophet (SAW) represents the completion and climax of all earlier prophetic missions: fulfilment and full blossoming of all antecedent authentic Divine revelations. Seen in this perspective, it becomes absolutely certain that whereas the objective and goal of Muhammad's prophethood cannot be different from those of all other prophets, it must necessarily reflect the characteristics of completion and full realization. And this by itself confers on him a distinct and special place in the galaxy of noble prophets. It is, therefore, clear that in order to understand the objective of Muhammad's prophethood we must first understand, as enunciated by the Holy Quran, the general objective of all prophets. Only then can we attempt to understand the distincictive nature of the goal and intent of Muhammad's (SAW) prophethood.

THE AXIAL PURPOSE OF PROPHETS

Three Doctrinal Beliefs

It is common knowledge that Islam comprises three foundational metaphysical beliefs viz *Tawheed, Ma'ad and Risalat*; in other words, belief and faith in Allah as the one

جولائی ۱۹۶۴ــــــــ جولائی ۱۹۹۴

ہمقدم کے ۳۰ تابناک سال

دعوت و عزیمت کی راہ میں

اسلامی جمعیّت طلبہ کے قدم بقدم

ہمقدم

اپنی اشاعت کے تیس سال مکمّل کر رہا ہے

اس موقع پر جولائی ۱۹۹۴ء کا شمارہ ہمقدم کی تاریخ کا عظیم الشّان

خاص نمبر ہوگا

اپنی رائے اور تجاویز جلد از جلد ادارہ ہمقدم کو ارسال کر دیں۔